ترقی پسند ادب کا ترجمان

انگارے

مرتبہ

سیّد عامر سہیل

ماہانہ کتابی سلسلہ نمبر ۱۹

دوسرا سال: ساتویں کتاب

جولائی ۲۰۰۴ء

مراسلت: ۵۴۵/c گل گشت کالونی، ملتان
ای میل: angarey@poetic.com
فون: ۰۶۱-۵۲۳۴۸۶ ، ۰۳۰۰-۹۶۳۸۵۱۶
مطبع: عاتکہ پرنٹنگ پریس، ملتان
قیمت: تیس روپے
زرِ سالانہ (بارہ شمارے): ۳۵۰ روپے

ترتیب

۱۔ چند باتیں — سید عامر سہیل — ۳

مضامین:

کہانی:

۷۔ موپساں/لیاقت رضا جعفری — ۶۶

سلسلہ وار ناول:

۷۔ ایک مرد (قسط ۹) — اور یا نا فلاشی/خالد سعید — ۶۹

تبصرہ:

۸۔ غربتِ شام دشتِ تنہائی — دل نواز دل — ۷۹

شاعری:

۹۔ دو غزلیں — ڈاکٹر خیال امروہوی — ۸۳
۱۰۔ چار غزلیں — خاور اعجاز — ۸۴
۱۱۔ دو غزلیں — پرویز ساحر — ۸۶
۱۲۔ دو غزلیں — ظفر اقبال نادر — ۸۷
۱۳۔ زرد چاند کا آخری دن (نظم) — خالد ریاض خالد — ۸۸
۱۴۔ سیلاب زدہ بستی (نظم) — خالد ریاض خالد — ۸۸
۱۵۔ خواب اور خاک کے درمیان (نظم) — ماورا احمد — ۸۹

حروفِ زر (قارئین کے خطوط):

۲۰۔ بنام مرتب — ۹۰

سید عامر سہیل

چند باتیں

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

خالد علیگ، سراپا ترقی پسند شاعر

پختہ سماجی شعور، مثبت انقلابی سوچ اور توانا فکر ونظر کے شاعر جناب خالد علیگ کی غزلوں کا مختصر سا مجموعہ ''غزالِ دشتِ سگاں'' میرے سامنے ہے اور اس کے مطالعے کی روشنی میں مجھے کہنا پڑتا ہے کہ پچھلے چالیس برسوں میں اُردو غزل اپنے طرز اور موضوع ومواد کی جن ارتقائی منزلوں سے گزری ہے اور سیاسی وسماجی شعور کی جن لہروں کے ساتھ آگے بڑھی ہے، ان لہروں اور غزلوں کی نمود اگر کسی کو یکجا، کسی ایک غزل گو شاعر کے یہاں دیکھنا ہو، تو صرف خالد علیگ کے کلام کو دیکھنا کافی ہوگا۔

وجہ یہ ہے کہ ۱۹۵۰ء کے بعد اُردو کے جن شعرا نے زندگی کے باب میں اپنے رجائی زاویۂ نظر، تابناک مستقبل کی بشارت اور دل نشیں اُسلوب کے حوالے سے سخن سرائی میں اپنی جگہ بنالی ہے ان میں خالد علیگ کا نام صرف نمایاں نہیں خاصا نمایاں ہے اتنا نمایاں کہ اگر ہم سرکاری، نیم سرکاری یا غیر سرکاری اونچی کرسیوں والے اور پی آر کے ذریعے آسمان پر اُڑنے والے شعرا کی طرف سے ذرا دیر کے لیے صرفِ نظر کرلیں اور خالد علیگ نیز ان کے ہم عمر وہم عصر شعرا پر ایک نگاہ ڈالیں تو ہر منصف مزاج و دیانت دار ناقد کو کہنا پڑے گا کہ خالد اپنی شخصیت و کردار کی صلابت اور فکر وفن کی استقامت کے سبب اوروں سے بہت الگ اور منفرد ہیں خالد علیگ کا یہ دعویٰ کہ ''میں ڈرا نہیں، میں دبا نہیں، میں بِکا نہیں، میں جھکا نہیں'' بے سبب نہیں، استقامت کردار کے ساتھ ہے۔

ہر چند کہ خالد علیگ کا ماحول ومعاشرہ جس میں وہ پلے بڑھے، تربیت پائی، پروان چڑھے اور فکر وفن سے آشنا ہوئے وہ دوسرے شعرا سے مختلف نہیں ہے، وہی ماحول ومعاشرہ ہے جس میں ہم آپ پروان چڑھے ہیں بایں ہمہ اگر ہم اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں اور خالد علیگ کی زندگی وشخصیت کا ایماندارانہ جائزہ لیں تو کہنا پڑے گا کہ ان کا کردار ہم میں سے اکثر سے بہتر و پاکیزہ، شائستہ و پختہ ہے، خالد علیگ کی زندگی کا ایک ایک نقش شاہد ہے کہ وہ طبعاً وفطرتاً انسان دوست ہے، مظلوموں کا غم خوار ومددگار ہے، ظالموں کا مدمقابل ہے، جابروں کا حریف اور کمزوروں کا غم گسار ومددگار ہے، میں اپنی بات کو کس طرح واضح کروں اس وقت الفاظ ساتھ نہیں دے رہے اس لیے وضاحت سے دست بردار ہو کر، خالد علیگ کی غزل کے چند اشعار بطور مثال وثبوت درج کر رہا ہوں

ہم صبح پرستوں کی یہ ریت پرانی ہے — ہاتھوں میں قلم رکھنا یا ہاتھ قلم رکھنا
یہ حلقۂ گیسو ہے وہ تاج سر کسریٰ — یہ زیب گلو رکھنا وہ زیر قدم رکھنا

غبارِ راہ سے کہہ دو ہمارے بعد اُٹھے — غبارِ راہ یہ سن لے کہ کارواں ہیں ہم
یہ خالد یہ تیرا بے باک، یہ مجذوب دیوانہ — اس عہد انقلاب آگیں کی دستاویز ہے ساقی
جو کہہ چکا ہوں اس سے مکرتا نہیں ہوں میں — اپنے سوا کسی سے بھی ڈرتا نہیں ہوں میں
کون و مکاں میں حرف نمو بولنے لگا — میں بول اُٹھا تو عالم ہو بولنے لگا
میں کیا کروں کہ میرا مقدر ہے ازل سے — تیرہ کشی میں صبح کے آثار دیکھنا
حدت فکر میں ہے شعلۂ گفتار میں ہے — روشنی مجھ میں نہیں ہے مرے کردار میں ہے

اس انداز کے اشعار، کہنے کو تو خالد علیگ کے ہم عصر دوسرے شعرا بھی کہہ سکتے ہیں اور بعض نے کہے بھی ہیں لیکن اس اندازِ تکلم اور بے باک لب ولہجہ کا سہرا جیسا کہ خالد علیگ کے سر سجتا ہے دوسروں کے سر پر نہیں سجتا، دوسروں کے یہاں، اس نوع کا لب ولہجہ عموماً تعلّی شاعرانہ اور تفاخر بے جا ہی کے ذیل میں آتا ہے اور کہنے والے کے ظاہر و باطن سے ہم آہنگ و پیوست نظر نہیں آتا جب کہ خالد علیگ کے اشعار ان کی بے باک طبیعت اور بے خوف اظہار کے سچے ترجمان بن کر خالد کی شخصیت و کردار کو مجسم کر کے ہمارے سامنے لے آتے ہیں اور ایسے ساحرانہ انداز سے لے آتے ہیں کہ ہم ان کے فن کی دلکشائی اور شخصیت کی دلربائی دونوں کے قائل ہوجاتے ہیں، خالد نے ایک جگہ کہا ہے

خالد رُموزِ فن سے تعلق نہیں مجھے — لیکن مرے کلام میں اک بانکپن تو ہے

اب خالد کو کون بتائے اور کس طرح بتائے کہ رموزِ فن سے یہ ان کا تعلقِ خاطر ہی تو ہے جو ان کے کلام میں بانکپن پیدا کرتا ہے اور یہ ان کے طرزِ اظہار کی رمزیت وایمائیت ہی تو ہے جو ان کی فکر نو اور باغیانہ لب ولہجے کو کلاسیکیت کے مدھم لہجے سے قریب تر رکھتی اور ان کی غزلیہ شاعری میں وہ رنگ ونور بھر دیتی ہے جو انہیں عہد نو کا نمائندہ غزل گو شاعر بنا دیتی ہے، مثال کے طور پر چند اشعار دیکھئے

اگرچہ خود کو سمجھنے میں اک زمانہ لگا — بُرا کہا بھی کسی نے تو پھر بُرا نہ لگا
ہزار ظلم وستم ہوں مدام زندہ باد — میرے عوام سلامت، عوام زندہ باد
یہ عہد کم نگہی، اس میں قدر جوہر کیا — غزالِ دشتِ سگاں ہوں مرا مقدر کیا
سودا ہے محبت کا تو سر ہاتھ میں رکھنا — اس دشت میں یہ زاد سفر ساتھ میں رکھنا
اے اہل ہنر اتنا ہنر ہاتھ میں رکھنا — دیوار اُٹھاتے ہو تو در ساتھ میں رکھنا

آیا تھا جو اک بار سروادیِ سینا — کیا بات ہے وہ بار دگر کیوں نہیں آیا

اک عمر سے میں خاک شفا بانٹ رہا ہوں — تو خاک بسر ہے تو اِدھر کیوں نہیں آتا

''خالد علیگ کے مجموعۂ غزلیات''، ''غزالِ دشتِ سگاں'' نے ایک اور بات مجھے باور کرائی وہ یہ کہ خالد کا مشاہدہ اور زندگی کا تجربہ تو متنوع ہے ہی لیکن ساتھ ہی ان کا مطالعہ بھی خاصا وسیع اور گہرا ہے انہوں نے مشرقی شعریات کی مستند کلاسیکی روایت سے بھرپور فائدہ اُٹھایا ہے خصوصاً غزل کے تعلق سے شعرا کو جن فنی لوازم کو برتنے پر مکلّف کیا گیا ہے وہ بھی نظراً وعملاً خالد کے پیش نظر رہے ہیں اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اپنی غزلیات کے مجموعے کو ''غزالِ دشتِ سگاں'' جیسے معنی خیز ودلآویز کلاسیکی نام سے موسوم نہ کرتے۔

سب جانتے ہیں کہ غزل ہمارے شعری ادب کی قدیم ترین ولطیف ترین روایت ہے اور آج تک زندہ وتابندہ ہے تبھی تو غزل کے مآخذ ومخرج کے باب میں شمس الدین محمد بن قیس رازی کی المعجم فی معائیر الاشعار العجم سے لے کر رشید وطواط کی حدائق السحر فی دقایق الشعر تک لمبی چوڑی بحثیں کی گئی ہیں اور غزل کے متعدد لغوی واصطلاحی معنی سمجھائے گئے ہیں ان معنوں سے عام طور پر لوگ واقف بھی ہیں لیکن غزل میں سوز وگداز کے بنیادی عناصر کے حوالے سے اس کنایاتی معنی سے جس سے خالد نے اپنی کتاب کا نام اخذ کیا ہے، بہت کم لوگ واقف ہیں، شمس الدین قیس رازی نے علم بیان وبدیع اور عروض واصناف سے متعلق اپنی مشہور کتاب المعجم میں لکھا ہے ''غزل کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ جب کتا ہرن کو شکار کرتا ہے اور ہرن بے چارگی اور بے بسی کے عالم میں نحیف سی آواز نکالتا ہے اور پُر درد آواز سے کتا ایسا متاثر ہوتا ہے کہ ہرن کو چھوڑ دیتا ہے اسے ''غزل الکلب'' کہتے ہیں۔

خالد علیگ نے اپنی غزلوں کے مجموعے کا نام، اسی تمثیلی معنی کی روشنی میں رکھا ہے اور غزل کے کلاسیکی مزاج خاص سے آشنا ہونے کا ثبوت دیا ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انہوں نے اپنی زندگی کے سارے تجربوں اور سیاسی وسماجی حالات کے سارے پہلوؤں کو اپنی غزل میں سمیٹا ہے اور اپنے دَور کی مروّجہ لفظیات کو جدید پیکر ومعنی دے کر، غزل میں اس طور پر ڈھالا ہے کہ وہ صف اوّل کے جدید غزل گو شعرا میں شامل ہوگئے ہیں ساتھ ہی مجھے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ غزل سرائی میں وہ یگانہ، چنگیزی، مجروح سلطان پوری اور شاد عارفی کے ہم رنگ وہم نوا بن گئے ہیں لیکن اس ہم نوائی وہم رنگی میں بھی انہوں نے اپنے انفرادی لب ولہجہ کو برقرار رکھا ہے اور یہی ان کی وہ خصوصیت شعری ہے جو اُن کی غزل کو تادیر زندہ اور ان کے نام کو سدا پائندہ رکھے گی۔

☆☆☆

ترتیب اور تعارف: ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن

کچھ فکشن نگاروں کے تیرہ غیر مطبوعہ خطوط

(۱۹۴۹ء-۱۹۹۹ء)

کم وبیش چالیس برس پر پھیلی ہوئی اپنی علمی، تدریسی اور انتظامی ذمہ داریوں سے میں نومبر ۲۰۰۲ء میں سبکدوش ہوا۔ ''فراغت اور آزادی'' میسر آنے پر میں نے زیادہ تر وقت اپنے شخصی ذخیرے میں موجود اکابر اہل علم وقلم کے خطوط کی جمع وترتیب میں صرف کیا۔

آج کی نشست میں کچھ بڑے فکشن نگاروں کے تیرہ خط، پڑھنے والوں کی خدمت میں پیش کیے جارہے ہیں۔ پہلے تین پروفیسر سیّد وقار عظیم مرحوم کے نام ہیں۔ بعد کے نو خط مجھ خاکسار (سید معین الرحمٰن ''الوقار''، ۵۰-لوئر مال، لاہور) سے موسوم ہیں۔ آخری خط خواجہ منظور حسین کے نام ہے۔ یہ بارہ خط ۱۹۴۹ء سے ۱۹۹۹ء تک کے تحریر کردہ ہیں۔ اس طرح ان خطوں کا دورانیہ نصف صدی سے زیادہ پر پھیلا ہوا ہے۔ پیش کردہ خطوں کی ترتیب یہ ہے:

خطوط بنام: پروفیسر سیّد وقار عظیم (۱):

۱۔ اوپندر ناتھ اشک (۲)، الہ آباد، ۱۴-فروری ۱۹۴۹ء۔

۲۔ اوپندر ناتھ اشک، الہ آباد، ۱۱-اکتوبر ۱۹۴۹ء۔

۳۔ اوپندر ناتھ اشک، الہ آباد، ۲۷-اکتوبر ۱۹۴۹ء۔

خطوط بنام: ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن:

۴۔ رضیہ فصیح احمد (۳)، مری، ۲۴-ستمبر ۱۹۶۴ء۔

۵۔ جمیلہ ہاشمی (۴)، لاہور، ۲۴-دسمبر ۱۹۶۴ء۔

۶۔ بانو قدسیہ (۵)، لاہور، ۱۳-مارچ ۱۹۶۳ء۔

۷۔ بانو قدسیہ، لاہور، ۱۵-اگست ۱۹۶۳ء۔

۸۔ بانو قدسیہ، لاہور، ۲۴-ستمبر ۱۹۶۴ء۔

۹۔ خدیجہ مستور (۶)، لاہور، ۳۰-ستمبر ۱۹۶۴ء۔

۱۰۔ بیگم ڈاکٹر شائستہ اکرام اللہ سہروردی (۷)، کراچی، ۱۵-اپریل ۱۹۶۳ء۔

۱۱۔ بیگم ڈاکٹر شائستہ اکرام اللہ سہروردی، کراچی، ۲-مئی ۱۹۶۳ء۔

۱۲۔ اشفاق احمد، داستان سرائے، لاہور، ۲۶-اکتوبر ۱۹۹۹ء۔

خط بنام خواجہ منظور حسین (۹):

۱۳۔ ڈاکٹر غلام علی چودھری (۱۰)، لاہور، ۳-مئی ۱۹۶۲ء۔

یہ سب خط غیر مطبوعہ ہیں۔ ''اصل'' خط میرے ذخیرے میں محفوظ ہیں۔ ان پر وضاحتی حواشی مزید تفصیل سے بھی ہو سکتے تھے، لیکن سرِ دست ان خطوں کی اشاعت مقدم ہے۔ اُمید ہے کہ یہ خط، لکھنے والوں کے اُسلوب، احوال، مزاج اور مافیہہ الضمیر کو سمجھنے اور جاننے کا ایک اچھا، معتبر حوالہ خیال کیے جائیں گے اور اِن کی قدر افزائی ہوگی۔

[۱]

خط بنام: پروفیسر سید وقار عظیم، کراچی

۵-خسرو باغ روڈ، الہ آباد — مورخہ ۱۴-فروری ۱۹۴۹ء

بھائی وقار، تسلیم

عرصے سے تمہارا کوئی خط نہیں ملا۔ میں بھی اتنا پریشان رہا ہوں، ایک جگہ سے دوسری جگہ اس طرح بھٹکتا رہا ہوں کہ تمہیں اپنا پتہ نہیں دے سکا۔ بہر حال میں الہ آباد میں آ گیا ہوں اور یہیں مستقل طور پر رہنے کا خیال رکھتا ہوں۔ یعنی جہاں تک میرے خیال کا تعلق ہے، حالات کو کیا منظور ہے، یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ اپنا حال چال لکھو۔ ''ماہِ نو'' (۱۱) نکلتا ہو تو اُسے میرے پتے پر بھیجو۔ بھابی کی خدمت میں سلام اور بچوں کو پیار۔ میرا مستقل پتہ یہی رہے گا۔ کوشلیا سلام بھیجتی ہے۔

خیر اندیش

اوپندر ناتھ اشک

[۲]

خط بنام: پروفیسر سید وقار عظیم، کراچی

۵-خسرو باغ روڈ، الہ آباد — مورخہ ۱۱-اکتوبر ۱۹۴۹ء

ڈیئر وقار،

تمہارا خط اور تازہ پرچہ ملا۔ شاید میں نے تمہیں لکھا تھا۔ میں بہت سی پریشانیوں میں گھرا رہا ہوں۔ تم اتنی دُور بیٹھے ہو اندازہ نہیں لگا سکتے۔ ایک طرف صحت خراب رہتی ہے۔ شیشے کے ڈبے سا جسم ہو گیا ہے جسے ہر طرح سنبھال کر رکھنے کی ضرورت ہے اور دوسری طرف زندگی کی کشمکش، ہر لحظہ سخت سے سخت تر ہوتی جا رہی ہے۔

دو اسکیچ تیار ہیں۔ ایک میں نے کوشلیا (۱۲) پر لکھا ہے۔ اُس نے ''جاوید'' لاہور کے کسی نمبر میں مجھ پر ایک اسکیچ لکھا ہے۔ ایک میں نے اُس پر لکھا ہے۔ دوسرا میرے ایک بچپن کے دوست پر ہے، جو بے حد اچھا بنا ہے۔ نام: کشمیری بدل اشک (۱۳)، اس کا تھوڑا سا حصہ لکھنؤ کے ایک غیر ادبی سے پرچے

میں چھپا بھی ہے لیکن ''ماہِ نو'' کے ناظرین کی نظروں سے قطعاً نہ گزرا ہوگا۔ اب دونوں میں سے جو چاہو، بھیج دوں۔ فرصت ملی تو کوئی نہ کوئی کہانی بھی تیار کر دوں گا۔

تمہارا: اشک

[۳]

خط بنام: سید وقار عظیم، کراچی

نیلا بھ پبلشرز اینڈ بک سیلرز — ۲۷-اکتوبر ۱۹۴۹ء

۵-خسرو باغ روڈ، الہ آباد

بھائی وقار۔ تمہارا محبت بھرا خط ملا۔ میں کیا بتاؤں، میں نے بارہا سوچا کہ تمہیں مفصّل خط لکھوں، لیکن زندگی کچھ اس حد تک پریشان ہے کہ میں، جو اپنی ڈاک کو باقاعدگی سے نمٹا دیتا تھا، اب بالکل اسے نہیں دیکھ پاتا اور کئی بار نہایت ضروری خط رہ جاتے ہیں۔

یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ میں فلم میں چلا گیا تھا۔ وہاں میں نے دس بارہ ہزار روپیہ پیدا کیا اور کمپنی سے استعفےٰ دے دیا۔ خیال تھا کہ لاہور پہنچ کر پبلشنگ کی جائے۔ کوشلیا سامان لے کر لاہور چلی گئی لیکن اسی مہینے میں بیمار ہو گیا، اُسے تار دیا۔ ہسپتال میں داخل ہوا۔ بائیس دن کے معائنے کے بعد معلوم ہوا دق ہے۔

لاہور کا خیال چھوڑ پنچ گنی سینی ٹوریم پہنچا۔ سینی ٹوریم میں تھا کہ تقسیم ہو گئی اور میں وہاں ترشنکو کی طرح وہیں لٹک گیا۔ ڈیڑھ سال وہاں رہا۔ روپیہ سب خرچ ہو گیا۔ پنچ گنی مہنگی جگہ ہے پھر سینی ٹوریم اور باہر کا دوہرا خرچ۔ کوشلیا گڈے کے ساتھ وہیں تھی۔

میں فکر مند تھا کہ اب کیا کِیا جائے کہ اطلاع ملی یو۔ پی گورنمنٹ نے میری ہندی خدمات کے عوض دو سال کے لیے پانچ ہزار روپیہ دینا منظور کیا ہے۔ چونکہ ابھی میں Negative نہ ہوا تھا اور چند مہینے وہاں رہنا چاہتا تھا، اس لیے سال بھر کا پورا روپیہ میں نے یک مشت منگا لیا۔

بمبئی کی زندگی بڑی Fast ہے۔ مریض کے لیے سود مند نہیں۔ یو۔ پی گورنمنٹ سے ایک سال تک دو سو روپیہ مہینہ ملنے کی اُمید تھی۔ الہ آباد میں پریم چند (۱۴) کے بڑے لڑکے (۱۵) اور لیڈر پریس کی ہندی پبلشنگ کے منیجر سے میری دوستی تھی، اس لیے سوچ سوچ کر الہ آباد ہی چلا آیا۔ یہاں آ کر کافی تکلیف اُٹھائی۔ جن دوستوں کے سہارے آیا تھا، اُن کی طرف سے کافی چرکے کھائے۔ پنجاب اور یوپی میں تمدنی فرق۔ اس کی وجہ سے کافی دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ بہر حال پانچ مہینے کی تکلیف کے بعد مکان مل گیا۔

کوشلیا نے پبلشنگ لائسنس اور پانچ ہزار روپیہ سرکار سے قرض لیا اور میری چار کتابیں ہندی میں شائع کر ڈالیں تا کہ میری دراز میں رہنے کی نسبت، کچھ رائلٹی دیں۔ فی الحال یہی رُوداد ہے۔ کتابیں

چھپ گئی ہیں۔ سات ہزار کے قریب روپیہ block ہو گیا ہے۔ خسارہ نہ رہے گا۔ (فائدہ نہ ہو تو خسارہ نہ رہے، اس کا میں نے انتظام کر دیا ہے) لیکن روزانہ خرچ کے لیے بڑی تنگی ہے۔

کبھی سوچتا ہوں پھر بمبئی چلا جاؤں، لیکن جسم میں بیماری نے طاقت نہیں چھوڑی۔ اس کا خیال کرتا ہوں تو روح لرز جاتی ہے۔ بس اسی طرح لشٹم پشٹم چلائے جا رہا ہوں۔

اسکیچ تیار تھا۔ ٹائپ کیا ہوا تھا، لیکن جیسا کہ میری عادت ہے تمہیں بھیجنے کے لیے revise کرنے بیٹھا تو تین صفحے بدل دیئے۔ اب الگ رجسٹرڈ پوسٹ سے بھیج رہا ہوں۔ اُمید ہے تم پسند کرو گے۔ کاٹ چھانٹ بہت ہے۔ کوشلیا نے ٹائپ نہیں کیا، ایک دوست نے ٹائپ کیا۔ بہت کانٹ چھانٹ کرنی ہوگی۔ پہلا زمانہ ہوتا تو سارے کے سارے اسکیچ کو دوبارہ ٹائپ کر کے بھیجتا۔ میں اب یہی بھیج رہا ہوں۔ اُمید ہے تم ایسے ہی چھاپ لو گے اور خیال رکھو گے کہ پروف میں غلطیاں نہ ہوں۔

دوسرا (اسکیچ) بھی جلد بھیجوں گا۔ کیا کروں ایک ساتھ میز پر بیٹھ کر چند گھنٹے کام نہیں کر سکتا۔ کندھے درد کرنے لگتے ہیں۔ ہندی میں ایک آدمی آتا ہے اُسے dictate کرا دیتا ہوں۔ اُردو میں یہ سہولت نہیں۔ کوشلیا کبھی کبھی لکھ لیتی ہے لیکن وہ گھر گرہستی کے کاموں میں اُلجھی رہتی ہے اور پھر دوسرے بیس جھگڑے ہیں۔

بھابی کو ہمارا سلام دینا۔ بچیوں کو پیار اور اپنا حال لکھنا۔ کبھی یوپی کی یاد آتی ہے کہ نہیں؟ کیا ممکن نہیں کہ کچھ دنوں کے لیے آ کر یہاں رہ جاؤ۔

تمہارا: اشک

[۴]

خط بنام: سیّد معین الرحمٰن، کراچی

زینت منزل، پنڈی پوائنٹ، مری ۲۴-ستمبر ۱۹۶۴ء

محترم بھائی (معین)، آداب!

آپ کا خط ملا، شکریہ۔ آپ کا سوال ''مہمل'' نہیں مگر مشکل ضرور ہے۔ بہر حال جواب حاضر ہے۔ ''فنون'' کے ایک شمارے میں جو جنوری میں شائع ہوا تھا، میرا ایک افسانہ ''چوہا'' شائع ہوا ہے۔ اگر کوئی اعتراض نہ ہو تو آپ اپنے اس مجموعے میں شائع کر سکتے ہیں۔

یہ افسانہ مجھے بھی پسند ہے اور بہت سے دوسرے لوگوں نے بھی اسے پسند کیا ہے۔ اس کے علاوہ تازہ ''فنون'' میں میری کہانی ''کالی برف'' اور ''نقوش'' میں ''پچھتاوا'' آ رہی ہے۔ آپ کو ان میں سے کوئی بہتر معلوم ہو تو اسے شامل کر لیجیے۔

آپ نے یہ نہیں لکھا کہ آپ کے وہ دوست کون ہیں جو اس کتاب کو ترتیب (۱۶) دے رہے ہیں۔ اگر کوئی حرج نہ ہو تو مطلع فرمائیں کہ وہ کون صاحب ہیں؟ کتاب کہاں سے شائع ہوگی اور کب تک؟

میرا ناول ''آبلہ پا'' (۱۷) نظر سے گزرے تو رائے لکھیے۔

اُمید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

ناچیز: رضیہ فصیح احمد

[۵]

خط بنام: سید معین الرحمٰن، بہاول نگر

معرفت محمد یعقوب خاں ایڈووکیٹ ۲۴-دسمبر ۱۹۶۴ء

۱۰-فتح شیر روڈ، ندیم منزل، سمن آباد، لاہور

محترم (معین الرحمٰن):

آپ کا خط ملا۔ میرا خیال ہے اگر آپ ''رنگوں کی جوالا'' کے بدلے ''کیسری'' (مطبوعہ ''نیا دَور'') رکھ لیں تو زیادہ اچھا ہوگا۔ فنی رکھ رکھاؤ تو میں جانتی نہیں مگر اس افسانے کے سلسلے میں یہ بات ہے کہ اس کی کہانی زیادہ جاندار اور عمل سے بھرپور ہے۔ اس میں ڈرامہ نسبتاً مکمل ہے اور کرداروں میں جو ایک لڑکی ہے، وہی تمام کہانی پر چھائی ہوئی ہے۔

میں اب تقریباً لاہور میں رہتی ہوں۔ اگر آپ اس سلسلے میں کچھ اور خط و کتابت کرنا چاہیں تو اُوپر دیئے ہوئے پتے پر لکھ دیجیے۔ اُمید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

جمیلہ ہاشمی

[۶]

خط بنام: سید معین الرحمٰن، کراچی

۴۷۹-این، سمن آباد، لاہور بانو قدسیہ

۱۳-مارچ ۱۹۶۳ء ایم۔اے ریڈیو جرنلسٹ

محترمی (معین الرحمٰن صاحب)-سلام مسنون

آپ کا افسانہ (۱۸) ملا۔ بہت پسند آیا۔ انشاء اللہ جلد کسی شمارے میں جگہ دوں گی۔ اُمید ہے آپ پھر بھی اپنے ''داستان گو'' کو نوازتے رہیں گے۔

والسّلام، نیاز مند

بانو قدسیہ

[۷]

خط بنام: سید معین الرحمٰن، کراچی

داستان گو، ۲۷-دی مال، لاہور

محترمی (معین الرحمٰن)، آداب ۱۵-اگست ۱۹۶۳ء

آپ کا خط عرصے سے واجب الادا تھا۔ بیچ میں یہ مشکل آن پڑی کہ اشفاق امریکہ جانے والے تھے۔ سارے سلسلے منقطع ہو گئے۔ کچھ دن تیاری میں گزرے اور کچھ عرصہ اشک شوئی میں۔ اب کچھ حالات نارمل ہوئے ہیں تو پچھلے دنوں کی کوتاہی کو پورا کرنے لگی ہوں۔

آپ کا ''داستان گو'' (۱۹) بند ہو گیا۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ''داستان گو'' سے محبت ایک شغل رندانہ تھا، کچھ اس کے اطوار کی خوبی نہ تھی۔ پھر بھی لوگوں کو بے طور اس پر پیار آتا تھا لیکن ہماری سنیے تو جیسے اس ''داستان گو'' نے چوس چاس کر پھینک الگ کیا۔ مالی طور پر پھانک ہو گئے، ذہنی طور پر سنکی، نہ دین رہا، نہ دُنیا۔

اب دوست چھوٹ چکے ہیں، قرض خواہ باقی ہیں۔ اپنی ادبی دُنیا ختم ہو گئی۔ رسالے کو یاد کرتے قدم قدم پر ملتے ہیں۔ ''داستان گو'' کی رعنائیاں ضرور یاد رکھیے، لیکن اشفاق اور میرے حق میں بھی دُعا کیجیے۔ کاش! اس کا بند ہونا ہمارے احیاء کی دلیل ہو۔

والسلام، مخلص: بانو قدسیہ

[۸]

خط بنام: سید معین الرحمٰن، کراچی

محترمی (معین الرحمٰن)، سلام مسنون ۲۴-ستمبر ۱۹۶۴ء

آپ کا نوازش نامہ ملا۔ شکر ہے آپ نے یاد تو کیا۔ سرِ دست یہ یادکام کے سلسلے میں سہی، لیکن متوقع ہوں کہ پھر بھی خط و کتابت جاری ہونے کے امکانات روشن ضرور ہو گئے ہیں۔

فرمایئے آج کل کیا کچھ کام ہو رہا ہے؟ یہاں تو یہ عالم ہے کہ ''داستان گو'' بند ہو گیا، لیکن ہم پر تو عجب قسم کی احمقانہ مصروفیات کا دور دورہ رہتا ہے۔ آپ احیاء کو پوچھتے ہیں، یہاں سرے سے بے تعلق ہوئے جا رہے ہیں۔ کچھ لوگوں نے تو ہمارے لچھن دیکھ کر ہمیں ادیبوں کی ٹکڑی سے ٹکسال باہر کر دیا ہے۔ یہ اُن کی زیادتی ہے یا ہماری کم ہمتی، اس کے متعلق ابھی کچھ فیصلہ نہیں کر پائی۔

آپ نے ''دلشاد'' کا انتخاب بالکل درست کیا ہے۔ آپ کا خط ملنے پر میں تلی نظری ہو کر بیٹھ گئی یا اللہ، کیا جواب دوں؟ سالِ رواں میں کچھ اور چھپا ہوتا تو بات بھی تھی۔ پچھلے اکتوبر میں ''باپ پرست'' کہانی ''نگارش'' کے لیے لکھی تھی، اس کے بعد یہ ''دلشاد'' لکھی ہے۔ دو ایک افسانے لکھے رکھے ہیں پر ابھی تک رسالوں کی اُٹھان دیکھ کر یہ فیصلہ نہیں کر پائی کہ چھاپنے کے لیے کس کو دوں؟

اُمید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔ کبھی کبھی اپنی خیریت سے ضرور مطّلع کیا کریں۔ والسلام

مخلص: بانو قدسیہ

[۹]

خط بنام: سید معین الرحمٰن

۲-کملہ راجہ اسٹیٹ، کینال پارک، لاہور ۳۰-ستمبر ۱۹۶۴ء

محترم (معین الرحمٰن)، تسلیم

آپ کا خط مل گیا تھا مگر جواب تاخیر سے دے رہی ہوں۔ ان دنوں بچی کی بیماری سے کافی پریشان رہی۔ ادھر کافی دنوں سے کوئی کہانی نہیں لکھی۔ بہر حال آپ ۱۹۶۳ء کے سالنامے ''نقوش'' سے میری کہانی بعنوان ''خرمن'' لے لیجیے۔ اس کہانی کے لیے میں صرف اتنا کہوں گی کہ مجھے پسند ہے۔

ندیم لالہ کو (۲۰) آپ خط لکھ کر اجازت لے لیں تو بہتر ہے۔ ویسے آپ کہانی لے لیجیے، میں اُن سے ملوں گی تو کہہ دوں گی۔ اُمید ہے کہ آپ بعافیت ہوں گے۔ والسلام

مخلص: خدیجہ مستور

[۱۰]

خط بنام: سید معین الرحمٰن

کاشانہ، کلفٹن، کراچی ۱۵-اپریل ۱۹۶۳ء

مکرمی (معین صاحب)، تسلیم

مجھے اس ریزولیشن (۲۱) سے اتفاقِ کُلّی ہے لیکن ایک سطر اور اس میں اضافہ کرنے کے بعد دستخط کرنے پر راضی ہوں گی۔ وہ یہ: ''یعنی اُمید ہے کہ کراچی یونیورسٹی، اس فیصلے کے ساتھ ہی ساتھ اُردو میں نصاب کی کتابیں مہیا کرنے کا انتظام بھی کرے گی، ورنہ معیارِ تعلیم پر بُرا اثر پڑنے کا احتمال ہے۔''

فقط: شائستہ سہروردی

[۱۱]

خط بنام: سید معین الرحمٰن، کراچی

کراچی ۲-مئی ۱۹۶۳ء

مکرمی معین الرحمٰن صاحب، السلام علیکم

ریزولیشن دستخط کے ساتھ واپس ہے۔ مجھے بہت ہی افسوس ہے کہ میرے وجہ سے اس میں اتنی تاخیر ہوئی۔ اُمید ہے کہ آپ (معاف) فرمائیں گے۔

فقط

شائستہ اکرام اللہ

[۱۲]

خط بنام: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، لاہور

داستان سرائے، ۱۲۱-سی، ماڈل ٹاؤن، لاہور ۲۶-اکتوبر ۱۹۹۹ء

عزیز گرامی قدر (ڈاکٹر سید معین الرحمٰن صاحب) السلام علیکم

آپ کا فرستادہ (غالب کا) دیوان (نسخۂ خواجہ) (۲۲) مل گیا تھا، ساتھ اس کے آپ کا محبت نامہ

بھی۔افسوس کہ میں وقت پر آپ کی فرمائش پوری نہ کرسکا۔سارا دن بے کار سا لیٹا رہتا ہوں اور ایسی ایسی باتیں سوچا کرتا ہوں جن کا لکھا جانا ابھی ممکن نہیں۔اسی اُدھیڑ بن میں شام ہوجاتی ہے اور رات کا سمہ آجاتا ہے۔

میں نے حسب فرمائش ایک نوٹ لکھ تو دیا ہے لیکن آپ اسے غور سے دیکھ لیں۔اگر کہیں کوئی تاریخی یا اتمامی غلطی ہو تو اس کو ٹھیک کردیں، آپ کو پورا پورا حق حاصل ہے۔یہ لفافہ آپ تک پہنچ جائے تو مجھے کارڈ لکھ کر رسید بھجوا دیجیے گا، ورنہ مجھے تشویش رہے گی۔(پہلے یہ عادت نہیں تھی، اب بڑھاپے نے وجود کے بازار کی کئی دوکانیں بند کردی ہیں۔) آپ کے لیے دعاؤں کے ساتھ۔

دعا گو: اشفاق احمد

[۱۲]

خط بنام: خواجہ منظور حسین

بالمقابل احمد یہ بلڈنگز، لاہور ۳-مئی ۱۹۶۲ء

محترم ومکرم جناب خواجہ (منظور حسین) صاحب، السلام علیکم

اُمید ہے مزاجِ گرامی بخیر ہوگا۔معذرت خواہ ہوں کہ کراچی میں حاضر خدمت نہ ہوسکا۔جیسا کہ میں نے ٹیلی فون پر عرض کیا تھا، مجھے اتفاقاً معلوم ہوا کہ آپ وہاں تشریف رکھتے ہیں، نہ کہ لاہور میں اور یہ بھی اُس وقت جب میں اس شام کی ''تیز گام'' پر نشست مخصوص کروا چکا تھا۔

ایڈنبرا میں اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اُمید سے زیادہ کامیابی ہوئی۔ایک سال اپنے خرچ پر گزارا۔اس کے بعد تا اختتام پروفیسر جان بٹ کی سفارش پر ایڈنبرا یونیورسٹی سے وظیفہ ملتا رہا۔ستمبر ۱۹۵۹ء میں وہاں گیا تھا، اکتوبر سے کام شروع کیا اور جنوری ۱۹۶۲ء میں Thesis پیش کردیا۔تین ممتحنوں نے اسے جانچا اور نہ صرف پی ایچ ڈی کی سفارش کی بلکہ Thesis کی Publication کی بھی۔

اس کے بعض پہلوؤں کے متعلق پروفیسر بٹ نے Admirable اور ہنری گفرڈ اور سی ایف ولیم سن نے Excellent کے الفاظ استعمال کیے۔پروفیسر بٹ Internal Examiner تھے مگر اُن کے Yale University اور California میں بحیثیت Visiting Professor چلے جانے کے بعد ولیم سن Internal Examiner مقرر کیے گئے حالاں کہ پروفیسر بٹ میرا پورا تھیسس پڑھ کر اپنی رپورٹ دے گئے تھے۔Oral Examination ہنری گفرڈ اور ولیم سن نے لیا۔

ایڈنبرا سے روانگی کے وقت یونیورسٹی کے اسسٹنٹ سیکریٹری نے مجھ سے کہا کہ ''چاہو تو یہاں واپس آسکتے ہو۔تمہیں بآسانی Senior Fellowship مل جائے گی اور سُنو اِس کی حالیہ قیمت میں (جو کہ تین سالوں کے لیے -/£750 -/£800 -/£850 ہے) اضافہ کردیا جائے گا۔'' ان الفاظ کے ساتھ اُنہوں نے میرے ہاتھ میں درخواست کے فارم دے دیئے۔

خواجہ صاحب قبلہ! اس ساری کامیابی کی بنیاد آپ نے اپنی مہربانی سے رکھی تھی۔آپ نے موضوع

کے انتخاب میں جس طرح میری رہنمائی فرمائی اور جس طرح بار بار اپنی بے شمار مصروفیتوں کے باوجود مجھے وقت دیا، وہ اس سوا دو سال کی جدوجہد میں مجھے یاد رہا اور انشاء اللہ آئندہ بھی ہمیشہ یاد رہے گا۔آپ کے احسانات کے لیے میں انتہائی شکر گزار ہوں۔

اب تک ملازمت کے سلسلے میں اپنے کالج (ایم۔اے۔او) اور اسلامیہ کالج والوں سے بات چیت ہوئی ہے اور معاملہ کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہیں۔لاہور سے باہر نکلنا میرے لیے محال ہے، لاہور میں میری دال گلتی نظر نہیں آتی۔ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے لندن میں کہا تھا کہ وطن میں کھپ سکو تو بہتر، ورنہ واپس آجانا اور نوبت شاید وہیں تک پہنچے گی۔بہر حال میں آپ کو اس کے متعلق پھر لکھوں گا۔

Thesis کے Preface میں مَیں نے آپ سے ممنونیت کا اظہار کرنا اپنا فرض سمجھا۔ایک نقل یہاں سے ٹائپ کرا کے آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں۔

لاہور تشریف لائیں تو دو لفظ اطلاع کے ضرور تحریر فرمائیں۔ممنون ہوں گا۔پتہ نیچے درج کر رہا ہوں۔والسلام

نیاز مند، غلام علی چودھری

Ghulam Ali Chaudhry
Opposite Ahmadya Buildings
Lahore - 7

حوالے اور حواشی:

۱۔ سید وقار عظیم، ولادت: الہ آباد، ۱۹۰۹ء، وفات لاہور، ۱۷-نومبر ۱۹۷۶ء۔
۲۔ اوپندر ناتھ اشک، ولادت: جالندھر ۱۴-دسمبر ۱۹۱۰ء، وفات: ۱۹-جنوری ۱۹۹۶ء۔
۳۔ رضیہ فصیح احمد، ولادت: مراد آباد، ۱۹۲۶ء۔
۴۔ جمیلہ ہاشمی، ولادت: گوجرہ ۱۷-نومبر ۱۹۲۹ء، وفات لاہور، ۱۰-جنوری ۱۹۸۸ء۔
۵۔ بانو قدسیہ، ولادت فیروز پور، ۲۸-نومبر ۱۹۲۸ء۔
۶۔ خدیجہ مستور، ولادت لکھنؤ دسمبر ۱۹۲۷ء، وفات: ۲۶-جولائی ۱۹۸۲ء۔
۷۔ بیگم شائستہ اکرام اللہ، ولادت: کلکتہ ۲۲-جولائی ۱۹۱۵ء، وفات: کراچی ۱۱-دسمبر ۲۰۰۰ء۔
۸۔ اشفاق احمد (تلقین شاہ)، ولادت: ۲۲-اگست ۱۹۲۵ء۔
۹۔ خواجہ منظور حسین، ولادت: دہلی ۳۱-مئی ۱۹۰۴ء، وفات لاہور، ۲۰-اگست ۱۹۸۶ء۔
۱۰۔ ڈاکٹر غلام علی چودھری (ولادت ۱۹۳۶ء) نے ۱۹۵۲ء میں افسانے لکھنے شروع کیے۔''ریگ رواں'' ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ان کے افسانوں میں بقول اشفاق احمد کوئی تراش خراش نہیں۔ یہ کہانیاں تو باتیں ہیں باتیں جن کی تعریف نہ ہوا نہیں لوگ گلیوں میں پڑھتے پھریں اور مدتوں تک

وہ یاد رہیں۔''

۱۱۔ ''ماہِ نو'' کراچی، شمارہ اوّل، ۱۹۴۸ء، مدیر اوّل، سید وقار عظیم۔

۱۲۔ کوشلیا اشک، اوپندر ناتھ اشک کی اہلیہ، ہندی کی معروف قلم کار۔ اوپندر ناتھ اشک پر کوشلیا کے خاکے کے لیے دیکھیے: اُردو کے بہترین شخصی خاکے، جلد سوم، مرتبہ: مبین مرزا، اسلام آباد، ۲۰۰۳ء۔

۱۳۔ کشمیری بدل اشک، اوپندر ناتھ اشک کے بے تکلف دوست۔

۱۴۔ پریم چند، ولادت: ضلع بنارس، ۳۱-جولائی ۱۸۸۰ء، وفات: بنارس، ۸-اکتوبر ۱۹۳۶ء۔

۱۵۔ پریم چند کی دوسری اہلیہ شیورانی سے بڑے لڑکے بسری پت رائے، ولادت: گورکھ پور، ۱۹۱۸ء، دوسرے صاحب زادے امرت رائے، ولادت: کانپور، اگست ۱۹۲۲ء۔

۱۶۔ سال ۶۴-۱۹۶۳ء کے جدید افسانوں کا انتخاب برادرِ عزیز و قریب جمیل صبا (وفات: ۹-مارچ ۱۹۸۹ء) کا منصوبہ تھا لیکن اسی زمانے میں وہ بیرونِ ملک سفر پر نکل گئے اور افسانوی پروگرام صورت پذیر نہ ہو سکا۔ جمیل صبا کا سفر نامہ (ایران، عراق، ترکیہ) لاہور سے ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا۔ اُن کا شعری مجموعہ ''اب دریچوں کو نہ بند رکھنا کبھی'' ۱۹۹۶ء میں لاہور سے شائع ہوا۔

۱۷۔ ''آبلہ پا'' (طبع اوّل ۱۹۶۴ء) رضیہ فصیح احمد کا اہم معاشرتی ناول ہے جس پر آدم جی ادبی انعام ملا۔

۱۸۔ آج یہ بات میرے لیے بالکل ناقابلِ یقین ہے کہ میں نے کبھی کوئی افسانہ لکھا، جو بانو قدسیہ کو ''بہت پسند آیا'' اور وہ ''داستان گو'' ایسے پرچے میں لائقِ اشاعت ٹھہرا! (معین الرحمٰن)

۱۹۔ رسالہ ''داستان گو'' ڈائجسٹ سائز پر اپنے زمانے کا بڑا مقبول اور منفرد رسالہ تھا۔ اشفاق احمد اور بانو قدسیہ اس کی ادارت سے طباعت، پیکنگ اور اس کی تقسیم و ترسیل تک کا سارا کام خود کرتے تھے۔

۲۰۔ مراد: احمد ندیم قاسمی سے ہے۔ شاعر، افسانہ نگار، مدیر رسالہ ''فنون'' (لاہور)، ناظم مجلس ترقی ادب، لاہور۔

۲۱۔ کراچی کے ممتاز اہلِ علم اور اربابِ دانش و قلم کی جانب سے، کراچی کے نوجوان ادیبوں نے ایک قرارداد مرتب کی تھی جس میں کراچی یونیورسٹی کے تمام شعبوں میں اُردو ذریعۂ تعلیم کو اپنانے پر زور دیا گیا تھا۔ بیگم شائستہ اکرام اللہ اس ریزولیوشن میں جزوی ترمیم پر مُصر تھیں۔ اس قرارداد پر کچھ اکابر اہلِ علم کے تائیدی اور توثیقی دستخط حاصل کرنے کی ذمہ داری میرے سپرد ہوئی تھی۔ (معین الرحمٰن)

۲۲۔ ''دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ- تجزیہ و تحسین'' نامی کتاب میں اشفاق احمد اور بانو قدسیہ، قیمتی اظہارات شاملِ اشاعت ہیں۔ (کتاب مذکور، مطبوعہ لاہور، ۲۰۰۰ء)۔

☆☆☆

ڈاکٹر مظفر عباس

انتظار حسین کے افسانوں میں عالمِ عرب کی صورت حال: شرم الحرم کی روشنی میں

انتظار حسین اُردو کے ایک اہم معاصر افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولوں میں ''بستی''، ''تذکرہ''، ''آگے سمندر ہے'' جب کہ افسانوی مجموعوں میں ''کنکری''، ''آخری آدمی'' اور ''شہر افسوس'' خصوصاً قابلِ ذکر ہیں اور بجا طور پر ان کے فن کی نمائندگی کرتے ہیں۔

انتظار حسین نے جس دَور میں افسانہ نگاری کا آغاز کیا، اس دَور میں دو قسم کے افسانے لکھے جا رہے تھے۔ ایک ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر لکھنے جانے والے افسانے جن کے موضوعات زندگی کے سماجی اور معاشرتی پہلوؤں کی نشاندہی اور سرمایہ دارانہ معاشرے میں ظالم و مظلوم کی کشمکش ہے۔ دوسرے سعادت حسن منٹو کے زیرِ اثر جنس کے حوالے سے لکھے جانے والے افسانے جن کا بنیادی محور عورت تھی۔ نئے لکھنے والے افسانے کے ان دو نمایاں نقطہ ہائے نظر کے ساتھ اپنے آپ کو منسلک کر رہے تھے۔

اُصولی طور پر تو انتظار حسین کو بھی ان میں سے کسی ایک نقطۂ نظر کو اپنانا تھا مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ شاہراہِ عام سے ہٹ کر اپنے لیے ایک الگ راہ نکالی۔ انہوں نے قدیم تہذیب اور مذہبی اساطیری روایات کی کڑیوں کو معاصر صورت حال سے جوڑنے کی کوشش کی اور اس طرح بے شمار گم شدہ کہانیاں ان کے ہاتھ آ گئیں۔ یہ کہانیاں لمحہ موجود میں بھی معنویت کی حامل ہیں اور مستقبل کے امکانات کی طرف بھی اشارہ کرتی ہیں۔ چنانچہ انتظار حسین کا فن ایک وسیع تر تناظر میں سفر کرتا ہوا نظر آتا ہے اور یہ قاری کو بھی دوشِ وفردا کے بندھنوں سے بے نیاز ہو کر آزاد اور وسیع تر فضا میں سانس لینے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اس پس منظر میں انتظار حسین کی افسانہ نگاری میں دو رجحانات متوازی طور پر سفر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک ماضی کی اجتماعی یادداشت، دوسرے روحِ عصر۔ تاہم ان دونوں کا خمیر مذہبی فکریات سے اُٹھتا ہے۔ انتظار حسین نے خود ایک جگہ لکھا ہے:

''جس مذہب سے میرا تعلق ہے وہ مٹی سے بلند ایک طاقت ہے۔''

یہی وجہ ہے کہ انتظار حسین کے افسانوں میں ایسے موضوعات کی فراوانی ہے جن کا تعلق کسی نہ کسی طرح اُمتِ مسلمہ سے بنتا ہے۔

انتظار حسین کے افسانوں کو بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک وہ جو مذہبی حکایتوں، مقدس صحیفوں اور کتابوں کے واقعات اور اساطیری روایات کے حوالے سے لکھے گئے ہیں،

دوسرے وہ جن کا تعلق رواں دواں زندگی سے ہے اور جن میں عہد حاضر کے واقعات اور حالات حاضرہ کو موضوع بنایا گیا ہے، مگر خوبی یہ ہے کہ عہد حاضر کے ان واقعات اور حالات حاضرہ کو بھی وہ ماضی کی حکایات کے تناظر میں پیش کرتے ہیں۔ انتظار حسین کا افسانوی مجموعہ ''شہر افسوس'' اس سلسلے کی ایک نمایاں مثال ہے۔ انتظار حسین نے ان کہانیوں میں حالات حاضرہ سے ماضی کی گمشدہ روایات کا سلسلہ جوڑا ہے اور اس طرح نئے نئے مفاہیم اور نتائج کا استنباط کیا ہے، درحقیقت یہی ان کے فن کا اساسی نکتہ ہے۔

اُمت مسلمہ، عالم عرب خصوصاً فلسطین کی معاصر صورت حال کے حوالے سے، شہر افسوس انتظار حسین کا سب سے اہم مجموعہ ہے۔ ان کہانیوں میں عالم عرب کے مسائل پر بڑے بھرپور انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ پس منظر کے واقعات میں، سقوط یروشلم، عرب اسرائیل جنگ، مسلمان ممالک کی بے بسی اور فلسطین کے عوام کی بے چارگی شامل ہیں۔ انتظار حسین نے اپنے ان افسانوں میں عالم عرب اور اُمت مسلمہ کے شاندار اور تابناک ماضی کے حوالے سے موجودہ ابتر صورت حال کا جائزہ لیا ہے اور موجودہ حالات پر خون کے آنسو بہائے ہیں، ایسے ہی آنسو جو اِن سے قبل معروف شاعر مولانا حالی نے بہائے تھے

اے خاصہ خاصانِ رسل وقت دعا ہے
اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

مگر انتظار حسین محض آنسو ہی نہیں بہاتے، وہ زوال کے اس دَور میں امت مسلمہ کی راہ نمائی بھی کرتے ہیں اور علم عرب بشارت کی نوید بھی سناتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ عنقریب مایوسیوں کے بادل چھٹیں گے اور زوال کی اس انتہا سے کمال کی ابتداء ہوگی، جس کا محرک وہ عالم عرب کی نوجوان نسل کو قرار دیتے ہیں۔ انتظار حسین کے نزدیک عالم اسلام اور عالم عرب کی تمام مشکلات اور مسائل ان کے اپنے پیدا کردہ ہیں مگر وہ عرب نوجوان نسل سے بہت اُمیدیں وابستہ کیے ہوئے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ ان مایوس کن حالات سے بہت جلد اُمید کی کرن پھوٹے گی جو عالم عرب میں مستقبل کے نئے اور روشن امکانات پیدا کرنے کا باعث بنے گی۔

انتظار حسین کا افسانہ ''شرم الحرم'' اسی پس منظر میں لکھا گیا ہے اور اس موضوع پر لکھے جانے والے افسانوں میں سب سے اہم ہے۔ اس افسانے کا تاریخی پس منظر عرب اسرائیل جنگ ہے، تاہم اس کا کینوس بہت وسیع ہے جو سقوط یروشلم سے لے کر عالم عرب کی معاصر صورتحال تک پھیلا ہوا ہے۔ افسانے کا ہیرو مصطفیٰ فائق ایک بہادر مصری نوجوان ہے اور تمام کہانی اسی کے گرد گھومتی ہے۔ مصطفیٰ فائق ایک اخبار کے دفتر میں عربی سے اُردو میں خبروں کا ترجمہ کرتا ہے اور روزانہ شام کو اخبار کے دفتر آتا ہے۔ اس کی رہائش یونیورسٹی ہوسٹل میں ہے۔ سقوط یروشلم کے بعد مصطفیٰ فائق اچانک غائب ہو جاتا ہے اور اب کہانی فلیش بیک میں چلتی ہے۔ چنانچہ اب ایک سفید ریش اعرابی نمودار ہوتا ہے جو ناقہ سوار اور شمشیر بکف ہے۔ اس کردار کی زبانی انتظار حسین مسلمانوں کے زوال کی وجوہات کی تفصیل بیان کرتے

ہیں اور اسی کی زبانی ان مشکلات و مسائل کا حل پیش کرتے ہیں۔ افسانے کا یہ اقتباس اسی جانب اشارہ کرتا ہے:

''۔۔۔ یہ کلام کر کے اس نے اس اونچے ٹیلے پر آگ روشن کی اور نیام کو دو ٹکڑے کر کے اس میں جھونک دیا۔ یہ دیکھ کر سب نے اپنی اپنی تلواریں نیاموں سے نکالیں اور نیام توڑ کر الاؤ میں جھونک دیئے۔۔۔''

مجموعی طور پر ''شرم الحرم'' ایک علامتی افسانہ ہے جس میں عالم عرب کی موجودہ صورت حال پر بھرپور تبصرہ کیا گیا ہے اس افسانے کے حوالے سے ہم اس حقیقت سے بھی آگاہ ہوتے ہیں کہ عرب دنیا کے مسائل کے حوالے سے انتظار حسین کا کس حد تک حقیقی اور گہرا ہے۔ افسانے کے آخری حصے کا یہ ٹکڑا ہماری اس بات کی تائید کے لیے کافی ہے:

''۔۔۔ ہمارے شہر کا ایک آدمی آج مجھ سے ملا تھا۔ تمہیں پتہ ہے کہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔۔۔ کہ مجھے ان دنوں نیند نہیں آتی۔۔۔ جب آنکھیں بند کرتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ میں بیت المقدس میں ہوں اور لڑ رہا ہوں۔۔۔ وہ آدمی جو مجھ سے ملا تھا میں خود ہوں۔ مصطفیٰ فائق رات کی اس گھڑی میں کہاں ہوگا۔۔۔ میں رات کی اس گھڑی میں کہاں ہوں۔۔۔ عمان۔ بغداد۔ دمشق۔ قاہرہ۔ الجزیرہ۔۔۔ کون سا شہر کہاں ہے۔۔۔ کون اس وقت کس شہر میں ہے۔۔۔ بچے کمہار کے بنائے پتلے کوزوں کی طرح توڑے گئے۔ کنواریاں کنویں میں گرتے ہوئے ڈول کی رسی کی مانند لرزتی ہیں۔۔۔ ان کی پوشاکیں لیر لیر ہیں۔۔۔ بال کھلے ہیں۔۔۔ انہیں تو آفتاب نے بھی کھلے سر نہیں دیکھا تھا۔۔۔''

☆☆☆

ناصر عباس نیر

فیض احمد فیض کی نظم ''شام'' کا تجزیہ

''شام'' (جو فیض احمد فیض کے چوتھے مجموعۂ کلام ''دستِ تہ سنگ'' میں شامل ہے) فیض احمد فیض کی دیگر نظموں سے مختلف بھی ہے اور ممتاز بھی! فیض کی شاعری کے عمومی اُسلوب میں ایک ایسی سحر طراز کیفیت ہے جو قاری کو فی الفور گرفت میں لیتی ہے۔ اس سحر طراز کیفیت کا دوسرا نام اُسلوب کی مانوسیت ہے۔ فیض جس آئیڈیالوجی کے علم بردار تھے اُس کا تقاضا ہی یہ تھا کہ ایک ایسا اُسلوب اختیار کیا جائے جو ترغیب اور بے تامّل ترسیل سے عبارت ہو۔ ایک زاویے سے یہ فیض کی ''طاقت'' ہے کہ وہ قاری کو اپنی طرف متوجہ کرنے اور اپنے نظریے کے ابلاغ میں کامیاب ہیں مگر دوسرے زاویے سے یہ ان کی ''کمزوری'' ہے کیونکہ ایک مانوس اور عمومی اُسلوب کا لازمی مطلب یہ ہے کہ شاعر تخلیقی تجربے کی تجرید کو گرفت میں لینے سے زیادہ قاری کی توقعات پر پورا اُترنے کی کوشش میں ہے حالاں کہ تخلیق کار کا اصل منصب قارئین کی منڈی یا سٹاک ایکسچینج کے رجحان کو پیشِ نظر رکھ کر ''مال'' پیدا کرنا نہیں (اگرچہ اکثر ''تخلیق کار'' اس کاروباری ذہنیت کے مالک ہیں اور جہاں میں ''سُرخرو'' ہیں) ___ نظم ''شام'' میں فیض نے ایک غیر عمومی اور اجنبی سا اُسلوب برتا ہے۔ اسی وجہ سے فیض کا عام قاری (جو فیض کے ''دلکش'' اُسلوب کا قتیل ہے) اس نظم کی دہلیز پر تھوڑی دیر رُکتا اور اس کی اجنبی اُسلوبی فضا سے گھبرا کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ ادب کے اس عام اور بظاہر معصوم قاری کا المیہ یہ ہے کہ جہاں کوئی ادب پارہ زلیخا کی طرح اس کا دامن پکڑتا ہے، وہ یوسف کی طرح دامن چھڑا کر بھاگ جاتا ہے حالاں کہ اچھا ادب پارہ وہی ہے جو پہلے دامن پکڑ لے اور پھر قلب و ذہن کو جکڑ لے۔ چنانچہ ادب کے قارئین دو طبقوں میں ہمیشہ بٹے رہتے ہیں۔ ایک طبقہ ادب سے ملنے والی مسرت کو بلا تاخیر، پہلی نظر اور پہلے ہی قدم پر حاصل کرنا چاہتا ہے جب کہ دوسرا طبقہ جامِ مسرت کو ٹھہر ٹھہر کر، جرعہ بہ جرعہ پینے، مسرت کو برابر التوا میں رکھنے، اپنے جبر اور ادب پارے کے ''ظرف'' کو آزمائش میں ڈالنے کا قائل ہے۔ فیض کی اس نظم میں قارئین ادب کے اس دوسرے طبقے کی دلچسپی کا وافر سامان موجود ہے مگر پیشِ نظر رہے کہ اچھے ادب پارے کے ضمن میں جس اجنبیت کی بات ہو رہی ہے وہ روسی ہیئت پسندوں کی Defamiliarization ہے نہ کہ اینگلز اور دیگر مارکسیوں کی مغائرت (Alienation) اوّل الذکر اُسلوب کا وہ وصف ہے جو کسی شے کو حیرت، استغراق اور باطنی شرکت کے ساتھ تجربہ بنانے کی تحریک دیتا ہے جب کہ مغائرت سماجی رشتوں سے علیحدگی اور داخلیت پسندی ہے۔ فرق ظاہر ہے۔

زیرِ تجزیہ نظم کے اُسلوب کی اجنبیت دراصل اس کے پیچیدہ استعاروں (Telescoped Metaphors) کی بدولت ہے۔ ان استعاروں کی مدد سے سکوت، انجماد اور انتظار کی حالت کو پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس نظم کا سیاسی مفہوم اور سماجی زاویہ واضح ہے۔

ہر استعارہ مستعارلہٗ اور مستعارمنہٗ یا آئی۔اے۔ رچرڈز کے لفظوں میں Tenor اور Vehicle پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس نظم کا Tenor پیڑ اور آسمان ہیں اور ان کے لیے جو استعارے استعمال ہوئے ہیں وہ مندر اور پروہت ہیں ___ یہاں چند باتیں بالخصوص اہمیت کی حامل ہیں۔ اوّل یہ کہ شاعر نے استعارہ سازی کے بنیادی اُصول Violation of Literalness کو برتا ہے۔ مستعارلہٗ اور مستعارمنہٗ کی ظاہری مماثلتوں سے زیادہ داخلی اور کلچرل مماثلتوں کو استعارہ سازی کی بنیاد بنایا ہے۔ ہر چند شاعر کو یہ استعارے شام کے منظر سے سُوجھے ہیں۔ شام کے بوجھل، زوال پذیر اور نیم تاریک لمحے میں پیڑ اُجڑے ہوئے، بے نور اور پراسرار لگتے ہیں، سرمئی آسمان جھکا ہوا، سرنگوں سا محسوس ہوتا ہے مگر شاعر نے اس منظر پر جمالیاتی تصرف کیا اور اسے منقلب کر دیا ہے، جس سے یہ دیکھا بھالا منظر نیا اور اجنبی سا ہو گیا ہے۔ غور کریں تو پیڑ اور مندر اور آسمان اور پروہت میں بعض ثقافتی رشتے اور نسبتیں موجود ہیں۔ مثلاً پیڑ کو اساطیر میں ٹوٹم کا درجہ ملا ہے اور اس کے ساتھ تقدس کا تصور وابستہ رہا ہے۔ قدیم سماج میں اسے مرکزیت حاصل تھی اور یہ سماجی ہم بستگی کا استعارہ تھا۔ گوتم اور متعدد صوفیا نے پیڑ کو مراقبے اور ارتکاز کے علامتی تصورات سے منسلک کیا۔ یہ سارے تصورات مندر سے بھی وابستہ ہیں۔ اسی طرح پروہت ایک خاندانی گُرو ہے، جو دراصل موجود اور ماورا کے درمیان تعلق کا وسیلہ ہے اور آسمان ہمیشہ سے اسی وضع کی مذہبی معنویت کا علمبردار رہا ہے۔ بعض دیگر مماثلتیں بھی قابلِ ذکر ہیں۔ مثلاً پروہت کا جسم پر راکھ ملنا (عام طور پر رِشی مُنی، جو گی سنیاسی راکھ ملتے ہیں، پروہت نہیں) شام کے سرمئی رنگ کے مشابہ ہے اور ماتھے پر سیندور کی نسبت، شام کے سورج سے واضح ہے۔ اس ضمن میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس نظم کے تمام کلیدی الفاظ اور استعارے (پیڑ، مندر، پروہت، سیندور، پائل، سنکھ وغیرہ) ہندی ہیں۔

مگر سوال یہ ہے کہ کیا استعارہ سازی کے ضمن میں ثقافتی بطون میں اُترنے کا یہ میلان بعض تہ دار ثقافتی معانی کے انکشاف کی خاطر ہے یا محض آرائشی عنصر یا کچھ اور؟ اس سوال کا جواب مندر اور پروہت کے سلسلے میں شاعر کی دی گئی وضاحتوں سے مل جاتا ہے۔ یہ وضاحتیں درحقیقت متذکرہ استعاروں کے معنوی امکانات کو شاعر کی آئیڈیالوجیکل جہات کا پابند بناتی ہیں۔ قاری اس نظم کی فضا میں آزادانہ اور اختیار کے احساس کے ساتھ گھومنے اور معنی آفرینی کرنے کے قابل نہیں ہو پاتا۔ شاعر کی آئیڈیالوجی کی چھڑی برابر اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہے ___ مندر کو بے نُور، پرانا اور اُجڑا ہوا قرار دیا گیا ہے۔ اس کا ہر بام چاک اور ہر دَر اپنا آخری سانس لے رہا ہے۔ گویا مندر موجود تو ہے مگر یہ انہدام کے قریب ہے اور اس انہدام کی وجہ یہ ہے کہ اسے بے نُور رکھا گیا ہے۔ لوگوں نے اسے اس کے حقیقی

مقاصد سے غیر ہم آہنگ پا کر اس سے تعلق توڑ لیا ہے۔ مندر میں روشنی کی موجودگی اس امر پر دال ہوتی ہے کہ لوگ اس کی روشنی کو اپنے داخل کے اُجالے کی علامتی معنویت کا درجہ دے رہے ہیں۔ اس امر سے یہ بھی ظاہر ہے کہ اشیا و مظاہر کی اصل معنویت کو اُس علامتی نشانیاتی نظام سے اخذ ہوتی ہے جو کسی ثقافتی گروہ کے ہاں اپنے عہد کی Episteme کے تابع ہو کر نشو و نما پاتا ہے ___ نظم میں یہ اصرار موجود ہے کہ مندر اب آخری دموں پر ہے اس حقیقت کا ادراک پروہت کو ہے، اس لیے وہ سرنگوں اور چپ چاپ بیٹھا ہے، شرمندہ اور بے بس ہے۔ مندر کا مذہبی، ثقافتی اور سماجی تلازمہ بہت واضح ہے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ یہ ثقافتی اور سماجی صورتِ حال کا استعارہ ہے، جو شاعر کے خیال میں شکست و ریخت کا شکار ہے اور پروہت ان لوگوں کی علامت ہے جو سماجی صورتِ حال کا ادراک کر سکتے اور اس کو بدل سکتے ہیں۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ان لوگوں میں ادراک کی قوت تو باقی ہے مگر صورتِ حال کو بدلنے کی صلاحیت سلب ہو چکی ہے۔ وہ اپنی اس بے بسی اور ناتوانی کا ادراک بھی رکھتے ہیں اس لیے سر جھکائے اور خاموش ہیں۔ شاید ہر صاحبِ ادراک کی تقدیر بھی یہی ہے۔

مندر اور پروہت کے حوالے سے شاعر نے جس صورتِ حال کا ذکر کیا ہے، یہ از خود کسی فطری قانون کے تحت پیدا نہیں ہوئی بلکہ اس کے پسِ پردہ کوئی ساحر ہے، جس نے آفاق پر سحر کا دام پھیلا دیا ہے اور دامنِ وقت کو دامنِ شام سے پیوستہ کر دیا ہے مگر یہ ساحر کون ہے؟ نظم کے سیاق و سباق میں یہ ایک ایسا کردار ہے جو غیر معمولی قوت رکھتا ہے اور ''ساحرانہ حکمتِ عملیوں'' کو وضع اور نافذ کر سکتا ہے۔ سرسری نظر سے دیکھیں تو یہ عام منطقی طرزِ فکر ہے، جو ہر شے کی علّت کو دریافت اور نشان زد کرتا ہے مگر غور کریں تو یہاں شاعر کی مارکسی آئیڈیالوجی عیاں ہے، جس کے مطابق سماجی اور ثقافتی صورتِ حال کا سُپر سٹرکچر، ایک انفراسٹرکچر سے تشکیل پاتا ہے اور انفراسٹرکچر بعض سماجی اور تاریخی قوتوں کی جدلیاتی شرکت سے وجود میں آتا ہے۔ فیض کی آئیڈیالوجیکل جہت کو ملحوظ رکھیں تو ساحر (۱) ایک تاریخی قوت بھی ہے اور عالمی سامراجی نظام بھی (جو سرمایہ دارانہ ہے)۔ مندر کے بے نور ہونے اور پروہت کے سرنگوں چپ چاپ بیٹھے ہونے کا ذمہ دار یہی قوت اور یہی نظام ہے۔ اگر موجودہ سیاسی تناظر کو پیشِ نظر رکھیں تو یہ نظم موزوں اور برمحل نظر آئے گی کہ تیسری دُنیا کے بیشتر ممالک اب تک سامراجی قوتوں کے زیرِ اثر ہیں۔ ان ممالک میں نوآبادیاتی نظام کی ''دوسری لہر'' چل رہی ہے یعنی ساحر بدستور موجود ہے، اُس نے فقط حکمتِ عملی تبدیل کی ہے۔

اکثر ترقی پسندوں کے ہاں (اور خود فیض کے ہاں بھی) تاریخی جدلیاتی قوت کو زیر کرنے اور

(۱) یہ نظم پہلے مارشل لاء کے زمانے میں لکھی گئی تھی تب فیض جیل کاٹ کے آئے تھے۔ اس طرح ساحر سے مراد فیلڈ مارشل ایوب خان بھی لیے جا سکتے ہیں۔ تجزیۂ نظم کے متن میں اس بات پر اس لیے زور نہیں دیا گیا کہ نظم کا تناظر اس سے وسیع ہے۔

نئے سویرے کے طلوع کی بہ تکرار خبر ملتی ہے اور اس طرح بظاہر فرد کی آزادیٔ عمل اور شرف کو پیش کیا جا رہا ہے مگر چونکہ یہ خبر صورتِ حال کے معروضی اور آزادانہ تجزیے (گو ترقی پسند اس کا دعویٰ ضرور کرتے ہیں) سے زیادہ مارکسی آئیڈیالوجی کی آرزومندانہ پیش گوئی ہوتی ہے، اس لیے یہ باطل رجائیت ثابت ہوتی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس نظم میں فیض احمد فیض نے ایسی کوئی پیش گوئی نہیں کی بلکہ ایک ایسے لمحے کو گرفت میں لیا ہے جہاں فرد کی بے بسی نمایاں ہے اور اس بے بسی کا واحد کشف یہ ہے کہ اب کبھی شام بجھے گی نہ اندھیرا ہوگا۔ یوں لگتا ہے جیسے اس لمحے شاعر نظریے کی کڑی گرفت سے آزاد اور نظریے کی محتسبانہ سرزنش سے بے نیاز ہو گیا ہے، وہ ایک ناوابستہ، آزاد ناظر کی طرح صورتِ حال کا ادراک کر رہا ہے مگر آزادی کا یہ لمحہ گزر جاتا ہے اور اس کے معاً بعد شاعر کو اپنی ''آئیڈیالوجیکل'' ذمہ داریاں یاد آ جاتی ہیں مگر اس ذمہ داری کو اب باندازِ دگر نبھایا گیا ہے۔ نظم کے آخری حصے میں لوگوں کی اس آس کا ذکر ہوا ہے کہ انجماد اور سکوت کی حالت اپنے اختتام کو پہنچے، رُکا ہوا وقت چل پڑے، کوئی سنکھ بجے، کوئی بت جاگے، کوئی پایل بولے۔ مرگ آسا سکوت کا طلسم ٹوٹے اور بولتی چہکتی زندگی کے آثار پیدا ہوں۔ غور کریں تو نظم کا یہ آخری بند Irony ہے۔ لوگ اُمید لیے بیٹھے ہیں کہ صورتِ حال بدل جائے گی مگر اس نظم کے متکلم کا منشا ان لوگوں کے انتظار پر طنز سے عبارت ہے کہ سنکھ کیسے بجے گا یا کوئی بت کیسے جاگے گا، مندر تو بے نور اور اُجڑا ہوا ہے گویا لوگ جس سماجی نظام سے توقّع استوار کیے بیٹھے ہیں، وہ (ساحر کی وجہ سے) شکست و ریخت کا شکار ہے۔ یوں ان لوگوں اور پروہت (جو راہنماؤں کی علامت بھی ہے) پر چوٹ کی گئی ہے جو ساحر کی چالوں سے ناواقف ہیں اور اندھی توقعات وابستہ کر لیتے ہیں۔

☆☆☆

خاورا عجاز

اکبرحمیدی۔آزادفضا کا شاعر

داخلی، خارجی/انفرادی، اجتماعی/ زمینی، کائناتی قسم کے مضامین کم وبیش ہرشاعر کے پاس ہوتے ہیں لہٰذا مجھے اس طرح کے رسمی جملے اکبرحمیدی کے بارے میں نہیں کہنے۔ میرا مشاہدہ ہے کہ اس نوع کے فقرے ہرادیب شاعر کے بارے میں کہے جاسکتے ہیں، کہے جاتے ہیں اور شاید اکبرحمیدی کے بارے میں بھی کہے گئے ہوں۔ایسا وہی لکھنے والے کرتے ہیں جو شاعر ادیب کا انفرادی مطالعہ نہیں کرتے اور ہرجگہ فٹ ہوجانے والی چند باتیں لکھ کر اپنا بھی بھرم رکھتے ہیں اور دوسروں کا دل بھی بہلاتے ہیں یا پھر یہ کام اُن لوگوں کا ہے جو مطالعہ تو کر لیتے ہیں لیکن اپنی کم استعداد کے باعث کوئی مرکزی رودریافت نہیں کرپاتے اور ٹامک ٹوئیاں مار کر وقت اور کاغذ کا پیٹ بھرتے ہیں یا پھر وہ کم ظرف لوگ جنہیں کچھ نظر تو آتا ہے لیکن بیان کرنے سے جان بوجھ کر کتراتے ہیں۔

اکبرحمیدی سخن فہم اور نکتہ سنج شعر گو ہے۔ وہ ذوقِ سلیم رکھتا ہے، آدابِ شعر سے واقف ہے اور شعری تنقید خوب جانتا ہے۔ بات کرنے اور کہنے کے اُسلوب اُسے اچھی طرح ازبر ہیں۔نئی بات کہنے کا ڈھب نکال لیتا ہے۔ جدید خیال کے لیے اُلٹ پھیر میں نہیں پڑتا، یہاں قدیم اس کی رہنمائی کرتا ہے اور وہ ماضی ہی کا چراغ لے کر حال سے گزرتا ہوا آئندہ کی طرف گامزن نظر آتا ہے

کہاں سے پھوٹتا ہے روشنی کا یہ چشمہ اُتر کے دیکھ کبھی آفتاب کے پیچھے

اکبرحمیدی کی شاعری کی ابتدا سکول میں ہونے والے بیت بازی کے مقابلوں سے ہوئی جہاں اُسے نظریہ ضرورت کے تحت خود شعر بنانا پڑے۔اُس کا اولین طبع زاد شعر کچھ ایسا کم رتبہ بھی نہ تھا

ظلمتیں دنیا میں ایسی چھا گئیں طاقتوں سے طاقتیں ٹکرا گئیں

یہی ابتدا اُسے اُردو زبان، ادب، کتاب اور رسائل کی طرف لے آئی جو اِس بات کی نشاندہی ہے کہ اُس کے اندر کا شاعر اپنے لیے راستہ ڈھونڈ رہا تھا۔اس شاعر نے محمد اکبر کی نوٹ بک میں اپنا اظہار کرنا شروع کر دیا جسے محمد اکبر کے استاد سید عسکری حسن عارفؔ نے مہمیز لگائی اور یوں ۱۹۵۴ء کے آغاز میں محمد اکبر، اکبرحمیدی کا روپ اختیار کر گیا

چاند پھر آج رات پورا ہے پیار اپنا ابھی ادھورا ہے

یہ تھی اکبرحمیدی کی ابتدا جسے کالج مشاعروں نے مزید تقویت بہم پہنچائی۔ادبی دنیا میں اُس کے اچھے آغاز کا اندازہ اس سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ اُس کے پہلے مجموعۂ کلام ''لہو کی آگ'' کا دیباچہ

ڈاکٹر سید عبداللہ کا لکھا ہوا ہے۔ یوں تو وہ ۱۹۶۰ء سے اخبارات اور رسائل میں چھپنا شروع ہو گیا تھا لیکن اوراق اور فنون تک وہ ۱۹۶۹ء میں پہنچا اور ۱۹۷۰ء میں اُس کا پہلا مجموعہ بھی سامنے آ گیا۔اس طرح وہ ادبی دنیا میں ساٹھ کی دہائی سے تعلق رکھنے والے شاعر کے طور پر متعارف ہوا اور ستّر کی دہائی میں پوری طرح دکھائی دینے لگا۔اُس کی غزل اُس طبقے کی نمائندگی زیادہ کر رہی تھی جس سے ذاتی طور پر خود اُس کا تعلق تادیر رہا یعنی وہ افراد جن کا کسی نہ کسی سطح پر استحصال ہو رہا تھا۔اکبرحمیدی گھریلو سطح پر تعلیمی پابندیوں دفتری سطح پر چالاک لوگوں کے ہاتھوں اور ادبی دنیا میں روند کر گزر جانے والوں کے ہاتھوں زک اُٹھاتا رہا۔اس کا عکس اُس کی شاعری میں آنا بڑی فطری بات ہے۔ بلاشبہ اس میں کچھ کمال اُس کی مشق ومہارت کا بھی رہا ہوگا لیکن جس تفصیل کو اُس نے اپنے اشعار کا اجمالی پیرہن عطا کیا ہے کم از کم اُن کی جذباتی صداقت پر اُس نے کوئی ملمع نہیں چڑھایا۔مزید یہ کہ اُس نے ردِعمل میں منفی ہونے کی بجائے مثبت انداز میں سوچا اور گلاب کے ساتھ ساتھ اس گھاس کو بھی کمتر نہ جانا جو قدموں تلے ضرور آتی ہے مگر دماغ تک طراوت پہنچا دیتی ہے تاہم جبر کے خلاف اُس نے اپنا موقف بیان کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی

ازل سے لڑ رہا ہوں ظالموں سے رہے گی جب تلک دنیا لڑوں گا

میں نے تمہیں پھولوں کی طرح پالا ہوا ہے کانٹوں سے کبھی صلح نہ کرنا مرے بچو

اکبرحمیدی دباؤ، بالادستی یا ڈامی نیشن کو قبول نہیں کرتا۔ یہ اُس کے مزاج کے منافی بات ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ بچپن میں اُس کی وہ آزادی رہی ہو جو والدہ کی رحلت اور والد کے اُس کی ذات میں غیر دلچسپی نے مہیا کر دی تھی۔ یہ رویہ اُس کے خود کو زندگی کے راستوں میں کچلے جانے سے بچا لینے کا ایک انداز بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہ خس وخاشاک کی طرح بہنا نہیں چاہتا تھا۔

اکبرحمیدی کی ابتدائی زندگی میں گاؤں بڑی اہمیت کا حامل ہے اور عمر کا آخری حصہ وہ ایک بڑے شہر میں گزار رہا ہے۔ان دونوں کے درمیان تگ ودَو کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ ناآسودگی سے آسودگی کی طرف، نامعلوم سے معلوم کی سمت، پستی سے بلندی کی جانب۔اس کوشش میں وہ بے شمار اونچ نیچ سے گزر کر آیا ہے اور یہ سارے تجربے اس کی شاعری میں جابجا بکھرے ہوئے ملتے ہیں

عیش ونشاط شہر کے حضرات کے لیے تازہ ہوائیں رہ گئیں دیہات کے لیے

نظر آئے گا اک ٹیلے پہ گاؤں جنوبی سمت میں سیدھا چلا جا

اکبر سادہ سا دیہاتی لڑکا تھا اک شہرن کے عشق میں اور سے اور ہوا

انہی مختلف النوع تجربات نے اُس کی شاعری میں ایک رنگارنگی پیدا کر دی ہے۔ وہ مختلف اطراف میں گھوم پھر کر زندگی کو انجوائے کرنے کا قائل نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک عالم فاضل کی

صحبت سے بھی فیض یاب ہوتا ہے اور ایک کم علم کے ساتھ بیٹھ کر بھی کچھ سیکھتا ہے۔ تنہائی سے گھبراتا نہیں اور محفل سے شرماتا نہیں۔ مذہبی نہیں لیکن تہذیب کا دلدادہ ہے، غرض یہ کہ وہ ہر انداز میں پایا جاتا ہے۔ یہی خوبی اس کی شاعری میں بھی موجود ہے جو کسی ایک ''کھونٹے'' سے بندھی ہوئی نہیں ہے بلکہ آزاد فضا میں اُڑتے ہوئے اُس پرندے کی طرح ہے جو ہر باغ اور باغ کی ہر ڈال کے گلے میں اپنے گیتوں کی مالا پہنانا چاہتا ہے۔ دیہاتی زندگی جزوِ لاینفک کی طرح اُس کی رگ رگ میں بسی ہوئی ہے۔ کنواں، کھیت، نہر، ہل، بیج، تالاب یہ سب اُس کے تجربے بھی ہیں اور مشاہدے بھی۔ اُردو کی حد تک وہ غزل کی روایت اور پھر شہری زندگی کے الٹ پھیر کے باعث ان تجربوں اور مشاہدوں کو اپنی شاعری میں زیادہ جگہ نہیں دے سکا لیکن ایسا بھی نہیں کہ وہ ان سے بالکل بیگانہ رہا ہو۔ پہلی نظر میں اکبر حمیدی اپنے شعر و فن میں کوئی بڑی بات کہتا نظر نہیں آتا۔ یوں لگتا ہے جیسے اُس نے عام بول چال کی زبان اپنالی ہے اور باتیں بھی عام سی کر رہا ہے جن میں کوئی مشاہداتی گہرائی یا گیرائی نہیں پائی جاتی لیکن ایسا ہے نہیں۔ اُس کے بظاہر سادہ سے اشعار میں گہری اور تہہ دار باتوں تک پہنچنے کے لیے کم از کم مجھے تو کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی۔

میں صدیوں کے تفاخر کی زباں ہوں — زمانے میرے اندر بولتے ہیں
میں اپنے ساتھ رہتا ہوں ہمیشہ — اکیلا ہوں مگر تنہا نہیں ہوں
تم اپنی کشتیوں کو رو رہے ہو — سُنو کہتا ہے دریا اور بھی کچھ
ایک دن ٹھہر آ کے پاس مرے — لامکاں کو مرے مکان میں رکھ
ہوئی ہے سیر دو عالم کی بے یقینی میں — میں اک نظر بھی نہ چلتا اگر یقیں ہوتا
جنوبی ایشیا کو جیسے اکبر — یہ دن کوئی ادھار دے رہا ہے
تمام لوگ ادھر سے ہی آتے جاتے ہیں — میں اس کی برم میں ہوں رہگزر میں رہتے ہوئے
اس کو نظر میں بھر رکھا ہے — آدھا کام تو کر رکھا ہے
عمریں بیت گئیں — سُرخ اشارے پر

تجرید اور نئے پن کے فوبیا سے فی زمانہ ہم اتنے متاثر ہو چکے ہیں کہ نارمل زندگی اب زیادہ اپیل نہیں کرتی۔ اکبر حمیدی نے محض شوخ رنگ یا بلند آہنگ ہو کر آج کی عمومی ''شعری ثقافت'' کا حصہ بننے کی بجائے دھیمے لیکن پائیدار رنگوں اور مدھم لے میں شعر کہہ کر اپنی گم ہوتی ہوئی شعری روایت کو آگے بڑھایا ہے اور زندگی کے اُن پہلوؤں پر اپنی توجہ مرکوز کی ہے جو انسانی زندگی کا اصل جوہر ہیں لیکن آج کی تیز رفتاری میں نظر سے اوجھل ہوتے جا رہے ہیں۔ اکبر حمیدی معاشی اور معاشرتی ناہمواریوں کے ساتھ ساتھ جذباتی اُتار چڑھاؤ پر بھی نظر رکھتا ہے۔ وہ اپنی بات کہتا ہے، دوسروں کے لب و لہجہ اور لغت سے اُسے کوئی سروکار نہیں۔ اس عمل میں وہ یقیناً کلاسیکی سہل ممتنع سے رشتہ استوار کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے

اک نظر ہی وہ مسکرائے تھے — آج تک جگمگا رہا ہوں میں

پلٹ کر دیکھتا ہے کیا چلا جا — بہت مجبور ہے تو جا چلا جا
نامکمل سی ہے دنیا میری — در و دیوار لیے پھرتا ہوں
کہنے والا بڑی بناتا ہے — بات کوئی بڑی نہیں ہوتی
میں وہاں ہوں جہاں سے اُس کی طرف — ان گنت راستے نکلتے ہیں

اکبر حمیدی ایک ایسے کلچر کا باشندہ ہے جو جنگل سے مناسبت رکھتا ہے۔ یہ جنگل ہر طرف واقع ہے، کبھی یہ سرسبز و شاداب دکھائی دینے لگتا ہے اور کبھی اس میں مچان باندھ کر بیٹھنے سے بھی جان نہیں بچتی۔ کسی موسم جب اس جنگل میں پھول اور پھل آتے ہیں تو بہار ہی بہار ہو جاتی ہے لیکن جب یہ موسم گزر جاتے ہیں تو جنگل خارِ مغیلاں سے بھر جاتا ہے اور ایک قدم اُٹھانا بھی دشوار ہو جاتا ہے وہی جنگل جو پھولوں اور پھلوں کی تہذیب اپنائے ہوئے ہوتا ہے، اگلے لمحے کانٹوں کا مذہب اختیار کر لیتا ہے

ہر سانس ہر قدم پہ اگر ڈر رہا ہوں میں — جنگل کی خامشی میں سفر کر رہا ہوں میں
وہی موسم وہی جنگل وہی آگ — بہے جاتے ہیں دریا اس برس بھی
تمہاری مانگ سے روشن ہوا ہے سب جنگل — تو راستہ بھی کہیں درمیاں سے نکلے گا
جنگلوں میں جو رہنا ہے اکبر — تیر بھی جوڑ کر کمان میں رکھ

اکبر حمیدی بات سے بات نکال لینے کا ماہر ہے۔ مسلسل، بغیر وقفے کے ایک بات کے پہلو سے دوسری بات بنا لینا اُس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اُس کے اِسی خیال افروزی کے رویے نے اُسے انشائیے کی طرف مائل کیا ہوگا۔ وہ معمولی باتوں سے غیر معمولی مطالب نکالنے کا فن جانتا ہے۔ چیزوں کو زاویہ بدل کر دیکھنے کا اُسے شوق ہے۔ اُس کی کوشش ہوتی ہے کہ گھسے پٹے موضوعات کو بھی اپنی سوچ کے دھارے میں شامل کر کے اُس میں نیا پن پیدا کر دے۔ گرد و پیش سے گہرے روابط بنا لے اور ایک وسعت اور ہمہ جہتی کا احساس بیدار کر دے۔ میں جانتا ہوں اکبر حمیدی انسان دوستی کے نظریہ پر یقین رکھتا ہے

ہاتھ کٹ جائیں تو سینے پہ سہارو اکبر — کوئی صورت ہو علم پیار کا اونچا رکھنا

شاید وہ اس حد سے آگے بڑھنا نہیں چاہتا اور اس سے آگے ہے بھی کیا۔ انسان ہی کائنات کا مرکز ہے اور بنیاد بھی لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیسا انسان کائنات کا مرکز و محور گردانا جا سکتا ہے۔ بس یہی وہ Red Thin Line ہے جہاں اکبر حمیدی لائن کے ایک طرف کھڑا ہے شاید یہ اُس کی مجبوری ہے۔ وہ انسان کو پورے کرّہ ارض پر منطبق کرتا ہے اور اگر کوئی حدِ تفریق مقرر بھی کرتا ہے تو مذہبِ عشق کی بنیاد پر، کسی مسلک کی بنیاد پر نہیں۔

☆☆☆

ابن حسن

جمالیات(۹)

ادب اور معروضی حقیقت

موپساں/لیاقت رضا جعفری

بَدصُورَت

یقیناً، عام لوگوں کے اِس مقدس عہدِ مساوات میں، اِس زمانۂ استکراہِ مستطیل میں، جیسا کہ ایڈگر ایلن پو کہتا ہے۔ اِس پُرمَسرت دور میں جب ہر آدمی اپنے آپ کو ہر دوسرے آدمی سے مشابہ ہونے کے سپنے دیکھتا ہے اور صورتِ حال کچھ یوں ہے کہ ایک بیرے اور صدرِ جمہوریہ میں فرق کرنا ناممکن ہو گیا ہے اور اِن دنوں میں کہ جو اُس امید افزا اور مبارک دن کے پیش رو ہیں، جس میں دنیا کی ہر چیز بے کیف اور غیر جانب دار یک سانیت کا شکار ہو جائے گی۔ ایسے عہد میں آدمی کو حق حاصل ہے بل کہ اُس پر فرض ہے کہ وہ بدصورت بن جائے۔

تاہم، لی بیو نے اِس حق کو بڑے یقین اور قوتِ جفاجُو سے استعمال کیا۔ اُس نے اپنا فرض ظالم ترین مردانگی سے پورا کیا اور حالات کو بدتر بنانے کے لیے یہی کافی تھا کہ تقدیر کی پُر اِسرار ستم ظریفی کی وجہ سے وہ ''لی بیو'' کا نام لے کر پیدا ہوا تھا۔ جب کہ اُس کا سرپرست، اختراع پسند تھا اور لاشعوری طور پر قسمت کی خوش فعلیوں میں اُس کا شریکِ جرم تھا۔ اُس نے لی بیو کو ''اینٹی لنس'' (۱) کا مسیحی نام دے دیا۔

حتا کہ ہمارے اُن معاصرین کے درمیان بھی، جو پہلے ہی آفاقی بدنمائی کے ممکنہ نظریئے کی شاہ راہ پر گام زن تھے۔ اینٹی لنس لی بیو اپنی بدصورت کی وجہ سے بہت اہم تھا اور آدمی یہ کہہ اُٹھتا کہ اُس نے بڑے مثبت انداز سے اِس معاملے میں بہت زیادہ طاقت جھونک دی ہے۔ پھر بھی وہ ''میر ابیو'' کی طرح ڈراؤنا نہیں تھا۔ ''میرابیو'' کو دیکھ کر لوگ حیران ہو کر کہتے تھے۔ ''اُو! کتنا خوب صورت دیو ہے۔'' افسوس! وہ بدصورتی کے حُسن سے محروم تھا۔ وہ بدصورت تھا۔ یہی کافی نہیں تھا۔ نہ اُس کے گھٹنے ٹکراتے تھے، نہ ہی اُس کی توند تھی۔ اُس کی ٹانگیں چمٹیوں کے جوڑے کی طرح نہیں تھیں اور اُس کے بازو نہ ہی طبقے تھے نہ چُھوٹے، پھر بھی اُس میں توازن کی کمی تھی اور یہ کمی نہ صرف ایک مصور کو نظر آتی تھی بل کہ ہر آدمی محسوس کر سکتا تھا کیوں کہ جو آدمی بھی بازار میں ملتا تھا اُس کی طرف مُڑ کے دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا تھا اور سوچتا تھا، ''یا خدا! یہ کیا چیز ہے؟''

اُس کے بالوں کا کوئی خاص رنگ نہیں تھا۔ اُس کے بال سرخی مائل بُھورے تھے۔ جن میں پیلا رنگ ملا دیا گیا تھا۔ یہی کافی تھا۔ وہ مکمل طور پر گنجا نہیں تھا لیکن اتنا گنجا تھا کہ اُس کا مکھن کے رنگ کا چمکتا ہوا سر نظر آتا تھا۔ مکھن کا رنگ؟ مشکل سے ہی، چربی کا رنگ زیادہ مناسب ہوگا اور ایسی زرد چربی!!

(۱) غیر معمولی حسین نوجوان جو شہنشاہ ہیڈرئین کی شدید محبت کا شکار تھا۔ وہ دریائے نیل میں ڈوب کر مر گیا۔ آیا وہ حادثاتی طور پر مرا یا اپنی زندگی سے تنگ آ کر مرا، کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

اُس کا چہرہ بھی چربی کی طرح تھا۔ ملاوٹ شدہ چربی کی طرح یقیناً اُس کھوپڑی کا رنگ خالص چربی کی طرح تھا بل کہ مقابلتاً مکھن کی طرح تھا۔ اُس کے منہ کے بارے میں بہت کم کہا سکتا ہے، کم سے بھی کم، بل کہ اُن کا مجموعہ صفر کے برابر ہے۔ یہ خیالی دیو کا منہ تھا یوں لیکن یوں سمجھئے کہ میں نے اس کے بارے میں کچھ بتایا ہی نہیں ہے۔

آیئے! اس فضول وضاحت کی جگہ یہ مفید فارمولا رکھ دیتے ہیں ''ناقابلِ وضاحت'' لیکن یہ ہرگز نہ بھولیے کے اینٹی لنس بی بیو بدصورت تھا اور یہ حقیقت نہ بھولیں کہ جو آدمی بھی اُسے دیکھتا تھا۔ دیکھتے ہی یہ سوچتا تھا کہ میں نے اُس سے بدصورت آدمی نہیں دیکھا اور ہم اُس کی بدقسمتی کے عروج تک یہ افسانہ کرتے چلیں کہ وہ اپنے بارے میں بھی یہی رائے رکھتا تھا۔

اُس کی زندگی میں صرف ایک خوشی تھی اور وہ یہ کہ وہ اندھیری راتوں میں تاریک گلیوں میں پھرتا تھا اور وہ دوشیزاؤں سے یہ الفاظ سُن کے خود ہوتا تھا، ''اے وجیہہ نوجوان! میرے ساتھ گھر آؤ۔'' اِس مقام سے آگے آپ دیکھیں گے کہ وہ نہ ہی بے وقوف تھا اور نہ بدفطرت، لیکن بلاشبہ وہ دُکھی تھا۔ ایک دُکھی آدمی صرف اپنی بدنصیبی کے بارے میں سوچتا ہے اور لوگ اس کی رات والی ٹوپی کو ایک بے وقوف کی ٹوپی سمجھتے ہیں جب کہ دوسری جانب اچھائی کی اِس لیے عزت کی جاتی ہے کہ وہ خوش کُن ہوتی ہے۔ اِس طرح اینٹی لنس لی بیو کو ایک بے وقوف بل کہ بدمزاج بے وقوف کے طور پر جان لیا گیا تھا۔ وہ اتنا بدصورت تھا کہ رحم کے قابل بھی نہیں تھا۔

افسوس! یہ ایک خفیہ خوشی تھی کیوں کہ ہو خوشی سچی نہیں ہے۔ کبھی کبھی یوں ہوتا تھا کہ اگر کوئی عورت بوڑھی ہوتی تھی یا نشے میں ہوتی تھی تو وہ اُس کی دعوت کا فائدہ اُٹھا لیتا تھا۔ اِسی دوران میں، جوں ہی، بالا جانے میں شمع جلائی جاتی تھی تو پھر وہ عورتیں اُسے ''وجیہہ نوجوان'' نہیں کہتی تھیں۔ جب وہ اُسے دیکھ لیتی تھیں تو بوڑھی عورتیں مزید بوڑھی بن جاتی تھیں اور نشہ باز عورتیں متین بن جاتی تھی اور کوئی ایک تو کراہت کے باوجود بھی خطرہ مول لے لیتی تھیں اور اچھی خاصی اجرت کے باوجود کہہ اُٹھتی تھیں۔

''میرے چھوٹے سے آدمی! مجھے کہنا پڑ رہا ہے کہ تم بدصورت ترین شخص ہو۔''

آخر کار اُس نے وہ قابلِ افسوس مَسرت بھی چھوڑ دی کیوں کہ اُسے، اُن کمینی عورتوں سے وہ ماتمی الفاظ سننے پڑتے تھے جو وہ اُس کے بارے میں کہے بغیر نہیں رہتی تھیں۔ جب وہ اُن کے ساتھ گھر جاتا تھا تو وہ کہتی تھیں:

''اچھا! میں ضرور بھوکی رہی ہوں۔''

افسوس! وہی تو بھوکا تھا، دکھی آدمی۔ وہ تو کسی ایسی شے کا بھوکا تھا جو محبت سے ملتی جلتی ہو۔ چاہے وہ کم ترین ہی کیوں نہ ہو۔ وہ اچھوتوں کی طرح زندہ نہیں رہنا چاہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُسے مردودوں کی طرح اُس کی بدصورتی کی بنا پر جلاوطن کر دیا جائے اور اُسے تو ایسی بدصورت ترین اور ناگوار

ترین عورت بھی خوب صورت لگتی تھی جو اُسے بدصورت نہ سمجھتی یا کم از کم اُسے، اُس کی بدصورتی کے بارے میں نہ بتاتی اور اُس عورت کا چہرہ داغوں بھرا ہوا تھا اور نشے کی عادت، اُس کی شکل سے واضح ہو رہی تھی۔ اُس منہ بے وقوفوں کی طرح تھا۔ اُس کے کپڑوں پر پیوند لگے ہوئے تھے اور اُس سے بدبو آ رہی تھی۔ اُس نے، اُس عورت کو اچھی خاصی اُجرت پیش کی۔ جس کی وجہ سے اُس عورت نے اُس کا ہاتھ چوم لیا۔ وہ اُسے اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ اُس کو نہلایا دھلایا، اُسے کپڑے پہنائے، اس کی خاطر کی اور اُس عورت کو اپنی نوکرانی بنا لیا، پھر اُسے گھر کی ذمہ داری دے دی۔ بعد میں اُس نے، اُس ترقی دے کر اپنی محبوبہ بنا لیا اور آخر کار، بلاشبہ، اُس کے ساتھ شادی کر لی۔ وہ تقریباً اُسی کی طرح بدصورت تھی، تقریباً، لیکن حقیقت میں اس کی طرح مکمل طور پر بدصورت نہیں تھی کیوں کہ وہ کریہہ المنظر تو تھی مگر اُس کی بدصورتی میں بھی ایک جادو تھا، ایک حُسن تھا۔ بے شک، ایسا حُسن، جس کی وجہ سے ایک عورت کسی مرد کو اپنی جانب کھینچ سکتی ہے اور اُسے عورت نے اُس سے بے وفائی کر کے یہ سب کچھ ثابت کر دیا اور وہ ایک اور مرد کے ساتھ تعلقات استوار کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

درحقیقت، وہ دوسرا آدمی، اُس شخص سے بھی زیادہ بدصورت تھا۔ وہ یقیناً زیادہ بدصورت تھا۔ وہ شخص ہر قسم کی جسمانی اور اخلاقی بدصورتی کا مجموعہ تھا۔ وہ شخص گداگروں کا ساتھی تھا اور وہ اُسے اپنے پرانے، آوارہ گرد ساتھیوں میں سے اُٹھا لائی تھی۔ اُس کے ساتھی یہ تھے، ایک پُرانا قیدی، ایک چھوٹی لڑکیوں کا کاروباری، ایک غلاظت بھرا خانہ بہ دوش، جس کی ٹانگیں مینڈک کی طرح تھیں۔ اُس کا مُنہ سانپ مچھلی کی طرح تھا اور اُس کا سر کسی مُردے کی طرح تھا اور اُس کے چہرے پر ناک کی جگہ دو سوراخ رکھ دیئے گئے تھے۔ تم نے مجھے اِس قسم کے کمینے سے بھی بُرا سمجھا۔'' اُس بدقسمت شوہر نے کہا۔ ''اور میرے اپنے ہی گھر میں اور اس طریقے سے کہ میں تمہیں بدفعلی کرتے ہوئے پکڑ لیا اے کمینی عورت! تم نے ایسا کیوں کیا؟ جب تمہیں پتا تھا کہ وہ مجھ سے بھی زیادہ بدصورت ہے تو تم نے یہ کیوں کیا؟ وہ حیران ہو کر کہنے لگی۔ ''اُوہ نہیں! تمہارے جی میں جو کچھ آئے کہو۔ تم مجھے غلیظ، پھوہڑ اور طوائف کہو مگر یہ نہ کہو کہ وہ تم سے زیادہ بدصورت ہے۔''

وہ بدقسمت آدمی وہیں کھڑا رہا۔ وہ اپس عورت کے آخری لفظوں تلے دب کر رہ گئے۔ اُس عورت نے اپنے منہ سے بلا سوچے سمجھے وہ الفاظ نکال دیئے۔ حُسن سے وہ خوف زدہ وہ گیا۔ وہ کہنے لگی: ''کیوں کہ تم اچھی طرح جانتے ہو وہ ایک خاص بدصورتی کا حامل ہے جب کہ تم ہر عام آدمی کی طرح محض بدصورت ہو۔''

☆☆☆

الفانسے ڈاؤڈے/شوکت نعیم قادری

ولی عہد کی موت

ولی عہد شدید بیماری کے باعث قریبِ مرگ ہے۔ اُس کی صحت یابی کے لیے تمام گرجا گھروں میں بڑی بڑی شمعیں روشن کی جاتی ہیں اور خصوصی عبادات کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ شہر کے قدیم رہایشی علاقے کی گلیوں میں اُداسی بال کھولے سو رہی ہے اور ساری فضا خاموشی کے بوجھ سے چور ہے۔ ایسے میں گھنٹیاں یوں خاموش ہیں، جیسے اُن سے اُن کی آواز چرا لی گئی ہو۔ رعایا کی متجسس نگاہیں محل کے جنگلے کے پار گڑی ہیں۔ پہرے دار انتہائی سنجیدہ ہیں اور غم زدہ لہجے میں ایک دوسرے سے محوِ گفتگو ہیں۔

ایسا لگتا ہے پورے کا پورا محل ہی کسی متوقع حادثے کے باعث مضطرب ہے۔ منتظمین اور داروغۂ محل انتہائی تیزی سے سنگِ مرمر کی سیڑھیوں پر محوِ خرام ہیں۔ راہ داریوں میں قاصدوں اور خواص کا ہجوم ہے۔ ریشمی چوغوں میں ملبوس درباری چھوٹے چھوٹے گروہوں میں کھڑے ہیں اور قریب سے گزرنے والوں سے تازہ ترین صورتِ حال جاننے کے متمنی ہیں۔ کشادہ زینوں پر خواصیں غم و یاس کی تصاویر بنی نظر آتی ہیں اور اُن کے دیدہ زیب منقش رومال اُن کی آنکھوں سے نہیں ہٹتے۔

محل سے ملحقہ باغیچے میں، چوغوں میں ملبوس معالجین کا ایک گروہ سر جوڑے کھڑا ہے۔ کمرے کی کھڑکیوں کے شیشوں سے اُن کی لانبی سیاہ آستینیں ہلتی ہوئی صاف دیکھی جا سکتی ہیں۔

کمرۂ خاص کے دروازے کے سامنے ولی عہد کا اتالیق اور گھڑ سواری کا استاد دونوں ٹہل رہے ہیں۔ وہ معالجین کے کسی حتمی فیصلے کے منتظر ہیں۔ گھڑ سواری کا استاد، ایک وفادار سپاہی کی مانند، ولی عہد کے حق میں قسم کھا کر اپنی وفاداری کا اظہار کرتا ہے جب کہ شاہی اتالیق قدیم رومی شاعر ہوریس (Horace) کی شاعری کے اقتباسات دہراتا ہے۔

شاہی اصطبل سے ایک طویل اور دردناک ہنہناہٹ سنائی دیتی ہے۔ یہ ولی عہد کے سرخی مائل خاکی گھوڑے کی آواز ہے جو اپنے ننھے مالک کو انتہائی دُکھ سے پکارتا ہے۔ اس کی کھرلی خالی پڑی ہے۔ ایسے مغموم حالات میں شاہی سائیس اسے بھی فراموش کر بیٹھے تھے۔

ایسے میں بادشاہ سلامت کہاں ہیں؟ وہ کہیں نظر نہیں آتے؟ انہوں نے ولی عہد کے کمرے سے دور محل کے دوسرے سرے پر خود کو مقید کر رکھا ہے کیوں کہ ایک بادشاہ کا برملا رونا اُسے زیب نہیں دیتا، لیکن یہ قدغن ملکہ کے لیے تو نہیں ہے۔ وہ ولی عہد کے پہلو میں مجسم غم بنی بیٹھی ہے۔ اُس کا دل کش چہرہ آنسوؤں سے تر بتر ہے، وہ بھی دیگر کنیزوں کی مانند سسکیاں بھر رہی ہے۔

ننھا ولی عہد اپنی مسہری میں لیٹا ہے۔ اس کا چہرہ سر کے نیچے رکھے تکیے سے بھی زیادہ سفید ہے۔ بہ ظاہر یہی لگتا ہے کہ وہ سو رہا ہے مگر ایسا نہیں ہے۔ ولی عہد ماں کی طرف کروٹ لیتا ہے۔ ''ملکہ جانی! آپ کیوں رو رہی ہیں؟ کیا آپ بھی دوسرے لوگوں کی مانند یہ یقین رکھتی ہیں کہ ہم مر رہے ہیں؟''

ملکہ کچھ کہنا چاہتی ہے مگر اُس کا جواب سسکیوں میں دَب جاتا ہے۔

''ملکہ جانی! مت روئیے! آپ کیوں بھول جاتی ہیں کہ ہم ایک ولی عہد ہیں اور ولی عہد یوں نہیں مرا کرتے۔'' یہ سن کر ملکہ کی درد بھری سسکیاں اور بڑھ جاتی ہیں۔ اب ولی عہد بھی خوف زدہ نظر آنے لگتا ہے۔ ''سنیے! وہ چیخ کر کہتا ہے۔ ''میں۔۔۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔ چالیس جری سپاہیوں کو فی الفور حکم صادر کیجیے کہ وہ ہمارے بستر کے جوگرد پہرہ دیں۔ ایک سو توپوں کو ہمارے کمرے کی کھڑکیوں کے باہر متعین کر دیجیے تا کہ وہ شب و روز اُن کی نگرانی کریں۔ اس کے بعد تو ہم موت پر افسوس ہی کر سکتے ہیں۔ کیا ان انتظامات کے بعد اسے ہم تک رسائی کی جرات ہونی چاہیے؟''

ملکہ ایک آہِ سرد بھرتی ہے اور ولی عہد کی دل دہی کے لیے احکام صادر کرتی ہے۔ پلک جھپکتے میں محل میں توپوں کی حرکت کی آواز سنائی دیتی ہے۔ چالیس مسلح سپاہی کمرے کے چوگرد اپنی اپنی جگہیں سنبھال لیتے ہیں۔ وہ سفید موچھوں والے انتہائی تجربہ کار سپاہی ہیں۔ ولی عہد اُن میں سے ایک کو پہچانتا ہے۔ ''لورین!'' وہ چلاتا ہے۔ سپاہی اُس کے قریب آ جاتا ہے۔ ''ہمیں اپنی شان دار تلوار دکھایئے۔ اگر موت ہمارے لیے آتی ہے تو تم اسے مار دو گے نا۔ کیا تم ایسا نہیں کرو گے؟'' ''کیوں نہیں صاحبِ عالم!'' اور بڑے بڑے آنسو اُس سپاہی کی سنولائی ہوئی گالوں پر بہنے لگتے ہیں۔

پادری ولی عہد کے قریب آتا ہے۔ اس نے مسیح کی شبیہہ سے مزین صلیب تھام رکھی ہے۔ وہ دھیمے لہجے میں ولی عہد سے ہم کلام ہے۔ ولی عہد کے چہرے پر حیرت کے آثار نمایاں ہیں۔ اچانک وہ اُسے ٹوکتا ہے۔ ''موسیو پادری! ہم آپ کا مطلب خوب سمجھتے ہیں۔۔۔ اگر ہم اپنے دوست 'بیپ پوَ' کو ایک خطیر رقم دیں تو کیا وہ ہماری جگہ موت کو قبول نہیں کر سکتا؟'' پادری کلام جاری رکھتا ہے۔ جب خاموش ہو جاتا ہے تو ولی عہد ایک آہِ سرد بھر کر کہتا ہے ''موسیو پادری! یقیناً یہ صورتِ حال انتہائی غم ناک ہے مگر ہمارے لیے ایک بات باعث اطمینان ہے کہ جب ہم جنت میں داخل ہوں گے تو ہمارا رتبہ ایک ولی عہد ہی کا ہوگا۔ ہمارا خدا جو ہمارا رشتہ کا بھائی ہے وہ ہمارے ساتھ ہمارے رتبے اور حیثیت کے مطابق ہی سلوک روا رکھے گا۔

پھر وہ اپنی ماں کی جانب مڑتا ہے۔ ''ہمارے بہترین کپڑے لائے جائیں۔ ایک تو سمور کی واسکٹ اور دوسرے مخملی جوتے۔ ہم چاہتے ہیں کہ فرشتوں کے سامنے ہم خوب صورت اور پروقار نظر آئیں اور ہم باغِ بہشت میں ایک باوقار ولی عہد کی مانند داخل ہوں۔'' پادری ولی عہد پر جھک کر دھیمے لہجے میں دوبارہ کچھ کہتا ہے۔ دورانِ گفتگو ہی ولی عہد اسے غصے سے ٹوک دیتا ہے۔ ''کیا ہم ایک ولی عہد نہیں ہیں؟ کیا ولی عہد کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی، کوئی رتبہ نہیں ہوتا؟'' وہ پادری کو بات کرنے سے روک دیتا ہے اور دیوار کی جانب منہ کر کے زار زار رونے لگتا ہے۔

(الفانسے ڈاؤڈے (۱۸۴۰ء-۱۸۹۷ء) Alphonse Daudet فرانسیسی ناول نگار اور افسانہ نگار۔ یہ اُن کی ۱۸۶۹ء کی کہانی The Death of the Dauphin کا ترجمہ ہے۔ یہ کہانی اس کتاب سے لی گئی ہے۔
Better Reading 2 Literature edited by Walter Blair & John C. Gerber, Scott, Foresman and Company, U.S.A. 1948 Page No. 236-238.

اوریانہ فلاشی/ خالد سعید

قسط ۱۱

ایک مرد

وہ کہ جسے سزائے موت کا فیصلہ سُنا دیا گیا ہو، اور جو جیل سے ایک ناقابل یقین اور معجزانہ فرار کے بعد دوبارہ پکڑ لیا گیا ہو، کس طرح اپنی اتھاہ مایوسی پر قابو پا کر ایک نئے فرار کی سوچوں کو منصوبہ بند کرتا ہے، ایک ایسا امر ہے جسے صرف وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو تمہیں تمہاری روح کی گہرائیوں سمیت جانتا ہو لیکن یہ محیر العقول واقعہ صرف ڈیڑھ ماہ کے اندر وقوع پذیر ہوا۔ یہ تب کی بات ہے جب انہوں نے تمہیں گاوڈی (Goudi) کے فوجی کیمپ سے دوبارہ بوآئیاٹی (Boiati) جیل منتقل کیا۔ اب وہاں پیٹسورا کوس (Patsourakos) جیل کا کمانڈنٹ نہ رہا تھا۔ تمہارے فرار کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ اُسے ذلت و بدنامی کا سامنا کرنا پڑا بلکہ ملازمت سے بھی ہاتھ دھونا پڑے۔ سیل کے دروازے پر قریب قریب پچاس برس کا ایک بھاری بھرکم شخص تمہارا منتظر تھا۔ اُس کا بہت بڑا گنجا سر تھا اور اتنی ہی بڑی مُڑی ہوئی چونچ دار ناک: ''صبح بخیر، آلیکاس، جیل واپسی پر خوش آمدید'' جیل واپسی پر خوش آمدید! تم نے اپنی نیم بند آنکھوں کے ذریعے اُس کی جانب دیکھا، سور ایسی موٹی آنکھیں، جو بیک وقت بے حسی اور کینہ توزی کی عکاس تھیں۔ چربی دار فربہ چہرہ اور اتنے ہی بھاری میلے اور لرزتے ہاتھ، ایسے ہاتھ جنہیں بڑی سہولت کے ساتھ منت سماجت کے لیے کسی کے آگے جوڑا بھی جا سکتا ہے اور اُسی آسانی سے کسی کو ضربِ کاری بھی لگائی جا سکتی ہے۔ ''تمہارا تعارف؟'' ''آلیکاس، میں اس جیل کا نیا کمانڈنٹ ہوں اور میرا نام نکولس زاکاراکس (Nicholos Zakarakis) ہے۔'' ''تو تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' ''آلیکاس، میں تم سے کچھ سنجیدہ گفتگو کا طالب ہوں، اور میری یہ بھی خواہش ہے کہ تم اس امر کو جان لو کہ میں اِن سب معاملات کو کس انداز میں دیکھتا ہوں۔'' ''زاکاراکس (Zakarakis)، بہتر ہوگا کہ تم خود ہی اِن معاملات کی وضاحت بھی کر دو اور اپنا زاویہ نگاہ بھی۔'' ''خیر جہاں تک میرا تعلق ہے میری سوچی اور سمجھی رائے میں تم ایک جانباز ہو، حقیقی معنوں میں ایک مرد، اور چونکہ میرے خیال میں تم ایک مرد حُر ہو اور جانباز بھی، لہٰذا میں نے تمہارے بارے میں بریگیڈیئر جنرل آئیونیڈیز (Ioannidis) سے فی الفور کھل کر گفتگو کی، میں نے اُسے بولا، جنرل صاحب، جو ماضی تھا وہ گزر چکا، آیئے اُن سب پچھلی باتوں کو بھول جاتے ہیں۔ اب ان موضوعات اور معاملات پر کوئی بات نہ ہوگی، آیئے اس نوجوان کی خطاؤں کو نظر انداز کر دیں اور اپنے کسی بھی صورت بدتمیزی اور بداراداوں کا کوئی جواز فراہم نہ کریں اور آپ خود دیکھیں گے کہ آخر کار وہ عقل کے ناخن لے گا اور اپنے کیے پر شرمسار ہوگا اور جنرل صاحب نے مجھ سے مزید پوچھا: ''زاکاراکس (Zakarakis) تم اس سلسلے میں کیا مشورہ دیتے ہو؟ اور میں جنرل صاحب کو صاف لفظوں میں بولا کہ ہمیں اس سے ہمدردی کا اظہار کرنا چاہیے اور ممکن حد تک عفو و درگزر سے کام لینا چاہیے اور اُس

سے مذاکرات کرتے ہوئے اُس کی ہتھکڑیاں اُتار دینی چاہئیں۔ اُسے ہم نے ایک سال سے ہتھکڑیاں ڈالی ہوئی ہیں۔ یہ ہتھکڑیاں کھولے دیتے ہیں۔ آیئے ہم اُس کے لیے خیر سگالی اور نیک تمناؤں کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ قدرتی بات ہے کہ سابقہ تجربات کی روشنی میں جنرل صاحب میری تجاویز کے سلسلے میں کوئی زیادہ پُر جوش نہ تھے، لیکن انہوں نے میری بات مان لی۔ انہوں نے کہا، سنو مسٹر زاکاراکس (Zakarakis)، اَب یہ سارا معاملہ تمہارے سپرد ہے، تمہیں کُلی اختیارات حاصل ہیں اور اس سلسلے میں تم اپنی صوابدید سے کام لو۔ تمہیں جو بھی طریقہ کار پسند ہو تم اس سے کام لے سکتے ہو، اور جو اقدامات بھی تم اُٹھانا چاہو، اُٹھا سکتے ہو۔'' اوخداوند یسوع! یہ کس قبیل کا بندہ ہے، بیک وقت ایک نجی اور عیار، دھمکانے اور ڈرانے والا، مگر ساتھ ہی مصلحت اندیش بھی۔ تم آدمیوں کی اس قبیل کو اچھی طرح جانتے تھے۔ یہ آدمیوں کی وہ قسم ہے جو ہر طاقتور، دھونسو اور ظالم کے آگے سجدہ ریز ہوتی ہے۔ سدا جیے پاپاڈوپاولس (Papadopoulos) جی او ہٹلر جی، جی فرانکو جی، زندہ باد زندہ باد، سالازار زندہ باد، مردحق مردحق ضیاالحق ضیاالحق، زندہ باد، زندہ باد، پوپ ہمارا، زندہ باد، قدم بڑھاؤ اے فلاں ہم تمہارے ساتھ ہیں، زندہ باد، زندہ باد، ہر اک حاکم نزدہ باد، بشرطیکہ اس سے کوئی ذاتی نقصان نہ ہو۔ علاوہ ازیں آدمیوں کی یہ قسم زیردستوں، کمزور اور اپنے سے بھی بدقسمت لوگوں کو قربانی کا بکرا بناتی ہے اور یوں خود اُن کے ساتھ جو ظلم اور زیادتی ہوئی ہوتی ہے، وہ اُس کا پورا انتقام ہے بس اور مقہور لوگوں سے لیتے ہیں۔ آمرانہ نظام ایسی ہی شخصیت کو جنم دیتا ہے، خصی اور نامرد، اور ایسی شخصیت ہی کلیت پسندانہ اور ناظمانہ نظام کو مستحکم کرتی ہے، یہ محض اتفاق نہیں، بلکہ ایک قاعدہ ہے کہ ایسی شخصیت ہی مثالی جیلر ہوتی ہے اور اگر یہ حاکم ہو تو پورے دیس کو ایک بڑی جیل میں تبدیل کر دیتا ہے۔ تمہیں فی الفور ردعمل کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا، تاکہ اُس کی موٹی عقل میں بھی یہ بات آجائے کہ تم کون ہو، تم نے اُسے سختی سے مسترد کرنا تھا اور اپنی لڑائی کو نئے سرے سے جاری رکھنے کے لیے اُسے اشتعال دلانا تھا۔ تم نے اُس کی بات میں مداخلت کی: ''زاکاراکس (Zakarakis) تم نے اپنی بات مکمل کر لی ہے؟'' ''نہیں آلیکاس، ابھی نہیں، میں اس میں مزید اضافہ کرنا چاہ رہا تھا۔'' ''زاکاراکس (Zakarakis) جمع خاطر رکھو، مطمئن رہو، مجھے پوری طرح علم ہے کہ تم میرے پاس کیا لینے آئے ہو۔ تم مجھے یہی بتانا چاہ رہے ہو کہ میں ایک وجیہہ اور حسین مرد ہوں اور تم مجھے بہت پسند کرتے ہو اور تمہاری خواہش ہے کہ میں تمہارے ساتھ ہم بستری کروں۔ یہ وہی ایک پرانی کتھا ہے اور ہر شخص جانتا ہے کہ فوجی جنتاؤں کے سارے چاکر ہی خصی اور مفعول ہوتے ہیں لیکن میری بات کان کھول کر سنو، میں تمہارے ساتھ ہم بستری نہیں کر سکتا۔ آج تو بالکل نہیں، بلکہ کبھی بھی نہیں، میں تمہیں متمتع نہیں کر سکتا، اس لیے کہ تم انتہائی کوڑھ شکل اور موٹے ہو، مجھے تم سے کراہت آتی ہے۔ میں تو تمہاری پتلون اُتار کر تمہارے بدہیئت موٹے چوتڑوں پر ایک سرسری نگاہ بھی نہیں ڈال سکتا۔'' ''مجرم، خونی، غدار، کمیونسٹ! کرائے کا قاتل۔'' اور وہ ہاتھوں سے دھمکی آمیز اشارے کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔

چند گھنٹوں کے بعد وہ دوبارہ ایک ضد کے سے انداز میں ظاہر ہوا۔ ''آلیکاس کچھ دیر پہلے جو

ہوا، میں اُس پر اظہار افسوس اور ندامت کرتا ہوں۔ دراصل اس میں سارا قصور میرا ہی ہے، کیونکہ اس سارے عرصہ میں مَیں اس بات کو نہ جان سکا کہ تم میرے ساتھ اٹھکیلیاں کر رہے تھے، حالاں کہ انہوں نے مجھے پوری طرح آگاہ کیا تھا کہ تمہیں ہنسی مذاق بے حد پسند تھا اور تمہارا شمار خوش طبع لوگوں میں کیا جا سکتا ہے، مجھے یہ بات یاد رکھنی چاہیے تھی اور دیکھو تو سہی، میں تمہیں منانے اور راضی کرنے کے لیے کیا تحفہ لایا ہوں۔ براہِ کرم مان جاؤ اور اب مجھے کہا سُنا معاف کر دو۔'' یکا یک تمہاری آنکھیں روشن ہو گئیں۔ وہ تمہارے ہاتھ میں مقدس تسبیح تھما رہا تھا اور تم کم سے کم ایک برس سے اس کے خواب ہی دیکھتے چلے آ رہے تھے، اس طرح کی تسبیح سے کھیلنا یا اُس پر وظیفہ پڑھنا تمہارا جنون بن گیا تھا اور اس کامل تنہائی میں یہ تمہاری اشد ضرورت بھی تھی لیکن تم نے اس تحفے کو قبول کرنے کی جسارت نہ کی اسے قبول کرنے کا مطلب یہ ہوتا کہ تم نے اُسے ہر جرم سے بری الذمہ قرار دے دیا تھا اور تم اُسے یہ کہہ رہے تھے زاکاراکس (Zakarakis) میں تمہارے نکتہ نظر کو سمجھتا ہوں، تمہارے بھی بال بچے ہیں اور تم بھی عام لوگوں کی اولاد ہو، میں تمہاری مجبوریوں کو جانتا ہوں، آؤ ہم صلح کر لیتے ہیں، اور یوں تم اُس کے کھیل میں ہار تسلیم کر کے ایک بھلائی کر لیتے۔ لیکن تمہیں اپنے موقف پر ڈٹے رہنا تھا اور اُس کے سامنے یہ ثابت کرنا تھا کہ تمہیں سختی یا نرمی کسی صورت جھکایا نہیں جا سکتا اور یہ کہ تم دونوں ایک دوسرے کے جانی دشمن ہو اور یہ خصومت ہمیشہ اسی طرح رہے گی۔ لہٰذا تم نے اس بیش قیمت تحفہ کو قبول کرنے کی خواہش کا گلا گھونٹ دیا۔ تم نے یوں ظاہر کیا جیسے تمہیں اس میں کوئی دلچسپی نہ ہو۔ ''نہیں چاہیے یہ مجھے'' ''ارے نہیں، تکلف مت کرو، مجھے تمہیں یہ تحفہ دے کر دلی خوشی ہوگی۔'' ''میں نے کہا نا، مجھے یہ نہیں چاہیے، مجھے تم سے صرف ایک شے چاہیے اور وہ ہے فلش ٹائلٹ۔'' ''ایک فلش ٹائلٹ؟ مگر کیوں؟'' ''اس لیے کہ اس بالٹی سسٹم نے میری زندگی اجیرن کر دی ہے، میں اس کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتا، ایک تو اس میں سے بے تحاشہ بدبو آتی ہے اور پھر یہ حفظان صحت کے اُصولوں کے بھی منافی ہے۔'' ''لیکن اس جیل کے تمام سیلوں میں رفع حاجت کے لیے بالٹیاں ہی موجود ہیں، کسی ایک میں بھی فلش ٹائلٹ کی سہولت نہیں ہے۔'' ''بہرحال میرے سیل میں تو تم یہ سہولت مہیا کرو گے۔'' ''آلیکاس براہِ کرم معقولیت پسندی کا مظاہرہ کر کے میرے اس قیمتی تحفہ کو قبول کرو۔'' ''میں فاشسٹوں سے کوئی تحفہ قبول نہیں کرتا، فسطائیوں سے میں صرف فلش ٹائلٹ کا مطالبہ کرتا ہوں، کیونکہ یہ میرا استحقاق ہے۔'' زاکاراکس (Zakarakis) کے سر سے گویا دھواں سا اُٹھا، گو وہ اس بات کو اچھی طرح جانتا تھا کہ دوران گفتگو جلد یا بدیر تم ضرور فاشزم کا لفظ استعمال کرو گے اور اس نے اس لفظ کے استعمال کی صورت میں اپنی طرف سے ایک معقول اور مدلل جواب تیار کر رکھا تھا، ''آلیکاس، میرے عزیز، تم ابھی نوجوان ہو اور بالکل اَن گھڑ، اور بعض چیزیں تمہاری سمجھ میں آ ہی نہیں سکتیں۔ جب میں تمہاری عمروں میں تھا تو میں بھی تمہاری طرح فاشزم کے بارے میں لمبی لمبی تقریریں کیا کرتا تھا۔'' ''مت بتاؤ مجھے کہ کبھی تم بھی فاشزم کے خلاف تھے۔'' ''لیکن میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ تب مجھ میں عقل نام کی کوئی شے نہ تھی اور پھر مسولینی نے ہمارے دیس پر حملہ بھی کر دیا تھا اور میں دل سے اُس سے نفرت

کرتا تھا مجھے ابھی تک ریمنی (Rimini) کی ایک شام یاد ہے۔ یہ ۱۹۴۰ء کا ذکر ہے اور شاید تمہیں بھی علم ہو کہ تب میں وہاں جنگی قیدی تھا اور وہاں کبھی کبھار میرا اطالوی فوجیوں سے بحث و مباحثہ ہو جاتا اور اُس شام بھی میں نے اُن کے منہ پر صاف صاف کہا کہ مسولینی ایک مجرم ہے اور نوعِ انسانی کی تباہی کا باعث۔'' ''بہت اچھے بھئی بہت ہی اچھے، کیا بات ہے زاکاراکس تمہاری، تب واقعی تم بہت ہی دلیر تھے، آفرین صد آفرین!'' ''اور آلیکاس پتہ ہے کہ انہوں نے مجھے کیا کہا، انہوں نے مجھے بتایا کہ مسولینی ایک عظیم رہنما ہے۔ اُس نے ایک نئی قوم کو تخلیق کیا ہے اور وطنِ عزیز میں ہر طرح کی دہشت گردی کا قلع قمع کر کے امن و امان بحال کیا ہے۔'' ''اور تم نے اُن کی بات پر یقین کر لیا، یہی کہا نا تم نے؟'' ''نہیں، میں نے اُن کی کسی بات کا اعتبار نہ کیا، میں نے تمہیں بتایا نا کہ میں اُن کچی عمروں میں بالکل تمہاری طرح یکسو ہو کر ایک ہی ذہن سے سوچتا تھا، میں نے اُن کی بات پر قطعاً کان نہ دھرا، بلکہ میں نے پُرزور احتجاج کیا اور اُن پر چلایا، سنو تمہیں دکھائی نہیں دیتا کہ صرف مسولینی کی وجہ سے تمہیں کیسے کیسے گھمبیر مسائل اور بدنصیبیوں کا سامنا ہے؟ لیکن انہوں نے میرے دلائل سے اتفاق نہ کیا اور صراحت سے اس امر کو واضح کیا کہ اُن کے مسائل اور بدقسمتیوں کا کارن انگریز، یہود اور کمیونسٹوں کی سازشیں ہیں لیکن میں ___ ارے بابا، میرا وہ جواب سُن لو جو میں نے اُنہیں دیا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ایسی صورت حال سے کس طرح نمٹا جا سکتا ہے اور تمہارے تو تصور میں بھی یہ نہیں آ سکتا کہ میں حکمت عملی کا کتنا بڑا ماہر ہوں، میں نے انہیں فوراً جواب دیا، دیکھو دوستو میں خود بھی یہودیوں کو دل سے ناپسند کرتا ہوں، لیکن تم نے یونان کو جارحیت کا نشانہ کیوں بنایا؟ کیا تم یہودیوں کا تعاقب کرتے کرتے یہاں آن گھسے ہو؟'' ''اور زاکاراکس، اپنی رام کتھا مختصر کرو اور صرف مطلب کی بات کرو۔'' ''نہیں، پہلے میری بات غور سے سنو، تمہیں پتہ ہے کہ انہوں نے مجھے کیا جواب دیا؟ اُن کا استدلال تھا، ہم نے یونان پر البانیہ کی خاطر قبضہ کیا ہے، وگرنہ یونانی اس پر قبضہ کر کے اسے اپنا صوبہ بنا لیتے اور اسے شمالی ایپورس (Epirus) کا نام دے دیتے۔'' ''زاکاراکس (Zakarakis) یہی حقیقت ہے اور اُن کا کہنا سچ تھا۔'' ''آلیکاس تم میری بات کو سنجیدگی سے سننا ہی نہیں چاہتے، کیونکہ میں نے بھی اُن سے یہی کہا تھا، ہاں البانیہ ہمارا حصہ ہے لیکن فسطائیت ایک سنگین جرم ہے، اور تمہیں علم ہے کہ انہوں نے اس سے کیا نتائج اخذ کیے؟ اُن کی سوچی سمجھی رائے میں فاشزم کے خلاف مزاحمت بدترین جرم تھا کیونکہ اگر آپ فاشزم کے خلاف لڑتے ہو تو اس طرح آپ خود ہی کمیونزم کے فتنہ کو طاقت بخش رہے ہو، اور وہ بالکل درست تھے، میرے بچے، بالکل درست اور میں بھی اس حقیقت کو پوری طرح جان گیا ہوں اور میں اس پر مزید یہ اضافہ کرنا چاہوں گا کہ میری طرح تم بھی پورے خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ اس گھناؤنے جرم کا ارتکاب کر رہے ہو۔'' ''زاکاراکس (Zakarakis) کیا تم واقعی اس پر یقین رکھتے ہو؟'' ''یقین رکھنا کیا مطلب، میں تو حسابی فارمولوں کی طرح اس پر حتمی رائے رکھتا ہوں جو کبھی غلط نہیں ہو سکتی، میرے بچے، میرے عزیز، فاشزم کے بارے مخالف حقیقت میں کمیونزم اور سوویٹ اوس کے ایجنٹ ہیں۔ غدارِ وطن'' اوہ ہو، ہو۔'' تم نے اس پر یہ ظاہر

کیا کہ جیسے اس بات پر تم ذہنی خلجان کا شکار ہو گئے ہو اور تم نے اُس پر اپنی مخصوص دل موہ لینے والی مسکراہٹیں نچھاور کیں جن سے بچنا شاید کسی کے لیے بھی ممکن نہیں۔ ''حیرت انگیز، قسم آسمانوں کی، یہ ایک دلچسپ استدلال ہے، پر میرے بزرگ کیا میں تم سے ایک سوال کرنے کی جسارت کر سکتا ہوں؟'' ''میرے بچے کیوں نہیں، میں اسی لیے تو یہاں آیا ہوں، میں تمہاری ہر بات کا جواب دوں گا اور تمہیں مطمئن کروں گا۔'' ''برادرِ بزرگ کیا تمہیں اطالوی زبان آتی ہے؟'' ''نہیں، میرے بچے، بالکل نہیں، میں تو صرف یونانی جانتا ہوں، میں نے کبھی کوئی اور بیرونی زبان، خواہ وہ جرمن ہو، فرانسیسی یا انگریزی سیکھنے کی کوشش تک نہیں کی۔ میں ایک سچا قوم پرست ہوں ایک کھرا اور کھُرا محبِّ وطن اور مجھے اس پر فخر ہے۔'' ''اور رمنی (Rimini) میں اطالوی فاشی فوجی یونانی زبان بولتے تھے؟'' ''نہیں، اُن جاہلوں کو تو کسی ایک یونانی لفظ کی شُد بُد نہیں تھی۔'' ''تو پھر اے احمقوں کے سپہ سالار، تم نے اُن سے اتنی بک بک اور جھک جھک کیسے کی، تمہیں تو یونانی زبان بھی صحیح طور پر نہیں آتی اور تمہارا لہجہ، صدقے جاؤں، مگر کسی کورے اَن پڑھ یونانی سے بھی بدتر ہے۔'' اُسے اپنے آپ سے اور جنرل آئیونیڈیز (Ioanidis) سے کیا گیا پیمان بھی بھول گیا، وہ مشتعل ہو گیا اور ڈنڈے سے تمہیں اتنا پیٹا کہ تم ہوش و حواس سے بے گانہ ہو گئے لیکن تم نے کسی مزاحمت کی کوشش نہ کی کیونکہ یہی تو تم چاہتے تھے اور اب تمہیں بھوک ہڑتال پر جانے کے لیے ایک عذر ہاتھ آ گیا تھا، تمہارا مطالبہ تھا کہ تمہیں ہر صورت فلش ٹائلٹ کی سہولت مہیا کی جائے، دراصل فلش ٹائلٹ کا حصول تمہارے اگلے فرار کے منصوبے کے لیے اشد ضروری تھا۔

زاکاراکس (Zakarakis) کو اس سے پہلے کسی بھوک ہڑتالی قیدی سے پالا نہ پڑا تھا اور نہ ہی وہ بھوک ہڑتال کے پہلے تین دنوں کی اہمیت کے بارے میں جانتا تھا۔ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب بھوک ہڑتالی کو خوراک کی شدید طلب ہوتی ہے اور ایک بار جب یہ وقت گزر جائے تو پھر فرد پر ایک ہلکی سی بے حسی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور یہ شے خوراک کی طلب کو کلیتاً ختم کر دیتی ہے۔ اپنی لاعلمی کے سبب اُس سے بنیادی غلطی کا ارتکاب ہوا اور اُس نے بھوک ہڑتال کے تیسرے ہفتے تک تمہیں دیکھنے کی زحمت بھی گوارہ نہ کی، زندہ رہنے کے لیے تم محض تھوڑے سے پانی پر گزارہ کر رہے تھے، تمہارے گال اندر کو دھنس گئے تھے، تمہاری ٹانگوں کا حجم تمہارے بازوؤں جتنا رہ گیا تھا اور تمہارے منہ سے اس قدر شدید بدبو آتی تھی کہ تمہارے قریب بھی کھڑا نہیں رہا جا سکتا تھا۔ تم پر نگاہ پڑتے ہی وہ خوف زدہ ہو گیا اور اُس نے وزارت انصاف کو مطلع کرنے کا فیصلہ کیا، ''وہ مر رہا ہے، وہ مر رہا ہے۔'' اور وزارت انصاف سے جواب آیا، ''اگر وہ ہلاک ہو گیا تو پھر تمہیں بھی ساری عمر جیل میں ہی گزارنا ہوگی۔ یہ ایک بین الاقوامی سکینڈل ہوگا اور ہم اس میں ملوث ہونا نہیں چاہتے۔'' ''عمر قید، مارے گئے، رحم کر رحم، اے خداوند یسوع، مجھے کسی طرح اُسے بھوک ہڑتال ختم کرنے کے لیے قائل کرنا پڑے گا۔'' وہ باورچی خانے میں آیا اور رات کے اُس کھانے کا جائزہ لیا جو اُنہوں نے اُس کے لیے تیار کر رکھا تھا۔ تب اُسے یہ جان کر بے حد مایوسی ہوئی کہ آج اُس کی پسندیدہ ڈش مسور کی پھلیاں (Lentils) پکی تھیں۔ خیر وہ اپنے من کو مار تمہارے لیے وہ ڈش اُٹھا کر لے

آیا۔ ''آلیکاس دن بخیر، دیکھو یہ ہم آئے ہیں۔'' آہٹ کی آواز ''زاکاراکس (Zakarakis) اب تم کیا چاہتے ہو؟ یہ کیا ہنگامہ ہے؟'' ''یار یہ میری پسندیدہ ڈش، مسور کی پھلیاں ہیں جو میں تمہاری خاطر لایا ہوں۔'' ''کون سی مسور کی پھلیاں؟ زاکاراکس (Zakarakis) اپنی منحوس شکل پرے کرو۔'' ''جانی، ضد نہ کر، کم از کم اسے چکھ کے تو دیکھو، تمہیں پتہ ہے کہ یہ بے حد لذیذ ڈش ہے اور تم بھی خوش ہو جاؤ گے۔'' ''میں کہتا ہوں، دفع ہو جاؤ۔'' ''اچھا اگر تمہیں یہ پسند نہیں، تو سٹیک ہو جائے، یا شوربہ یا پھر یخنی؟ ہاں یخنی، وہ تمہیں ضرور خوش آئے گی، اور یخنی کے ایک پیالہ کے لیے تو تم کیا کچھ نہیں کرو گے۔'' ''منحوس، نہیں مجھے کچھ نہیں چاہیے، نہ یخنی نہ شوربہ اور نہ ہی سٹیک۔ مجھے اپنے لیے صرف فلش ٹائلٹ چاہیے۔'' ''لیکن میں نے تمہیں بتا تو دیا کہ یہاں کسی فلش ٹائلٹ کی سہولت کی اجازت نہیں۔'' ''مگر تمہارے پاس تو یہ سہولت ہے۔'' ''بابا، سمجھنے کی کوشش کرو، میں یہاں کا کمانڈنٹ ہوں۔'' ''اور میں، میں ہوں، مجھے فلش ٹائلٹ ہر صورت چاہیے۔'' ''میں تمہیں یہ سہولت فراہم نہیں کر سکتا۔'' ''تم اگر چاہو تو یہ بالکل ہو سکتا ہے، تم مطلوبہ سامان خرید کر میرے سیل میں فلش ٹائلٹ لگوا سکتے ہو۔'' ''نہیں، ہرگز نہیں، ناممکن۔'' ''بس تو پھر میں تو مر ہی جاؤں گا اور تم ساری عمر اقدام قتل بلکہ قتل عمد کے جرم میں اسی سیل میں بھگتاؤ گے، بس انتظار کرو، میرے مرنے کے بعد، دنیا بھر کے اخباری نمائندے یہاں جمع ہوں گے اور وہ تمہیں میری ہلاکت کا ذمہ دار ٹھہرائیں گے، یہ ہے وہ شخص جس نے آلیکاس کو خوراک سے محروم رکھا اور اُس پر بہیمانہ تشدد کر کے اُسے ہلاک کیا اور جانتے ہو پھر کیا ہوگا، تمام مہذب ممالک یونان پر اقتصادی پابندیاں عائد کر دیں گے اور تمہاری وجہ سے بلکہ تمہاری حماقتوں سے ہمارے ملک کو مشترک منڈی سے نکال باہر کیا جائے گا۔'' ''اوئے تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟'' ''میں وہی کچھ کہہ رہا ہوں جو تمہاری سماعت مس بہت اچھی طرح آ رہا ہے اور یہ بھی کان کھول کر سُن لو کہ جنرل آئیونیڈیز (Ioannidis) اور پاپاڈوپاولس (Papadopoulos) بھی تمہیں ہرگز معاف نہ کریں گے۔ بس اب مجھے اکیلا چھوڑ دو، میں پُرسکون موت مرنا چاہتا ہوں اور اگلے جہان میں تو مجھے فلش ٹائلٹ کی سہولت مل ہی جائے گی۔'' وہاں سے رخصت ہوتے ہوئے زاکاراکس کی آنکھیں قریب قریب بھر آئی تھیں۔ وہ اُس رات قطعاً نہ سو سکا، وقفے وقفے کے ساتھ اگلے چند دنوں میں وہ مسلسل کبھی تمہاری نبض پر ہاتھ رکھتا اور کبھی ماتھے پر اور حالت کرب میں ٹھنڈی سانسیں بھرتا رہا۔ ایک تو واقعی تمہاری حالت روز بروز خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی تھی، دوسرے تم نے اُن حیلوں اور حربوں کو ایسے موثر طریقوں سے استعمال کیا کہ تمہاری حالت اُس پر اور بھی خراب ظاہر ہو۔ جیسے ہی وہ تمہارے قریب پہنچتا، تم اپنے لبوں کو خفیف حرکت دیتے۔ ''میں مر رہا ہوں ___ میں مر رہا ہوں، اے موت جلدی سے مجھے اپنے گلے سے لگا لے۔'' آخر کار اُس نے اپنی ہار مان لی۔ ''آلیکاس کیا تم میری بات سُن سکتے ہو؟'' ''ہاں ___'' ''اگر میں تمہیں فلش ٹائلٹ مہیا کر دوں، تو کیا تم تھوڑی سی یخنی پی لو گے؟'' ''مجھے تمہاری بات سمجھ نہیں آ رہی ___ دوبارہ بولو، کیا کہا ___؟'' ''اگر میں کسی طور تمہیں فلش ٹائلٹ مہیا کر دوں، تو کیا تم میری خاطر تھوڑی سی یخنی پی لو گے؟'' ''ہرگز نہیں، مطلق نہیں، پہلے فلش ٹائلٹ لگواؤ، پھر یخنی کی باری آئے گی۔''

''اچھا ٹھیک ہے بالکل ٹھیک، تمہیں فلش ٹائلٹ مہیا کر دیا جائے گا۔'' ''ابھی ابھی'' ''بابا بالکل ابھی'' نصف گھنٹہ بعد مزدور سیل میں کدالیں، کئی اور پھاوڑے لیے داخل ہوئے اور تم نے بھوک ہڑتال ختم کر دی۔

فلش ٹائلٹ کا خیال یا فلش ٹائلٹ کے ذریعے جیل سے فرار کا منصوبہ، تمہارے ذہن کے عقبی گوشوں میں کئی مہینوں سے پرورش پا رہا تھا، کیونکہ گاوڈی (Goudi) کے فوجی کیمپ میں ہی تم نے اس بات کو محسوس کر لیا تھا کہ جلد یا بدیر وہ تمہیں بوئیاٹی (Boiati) کے مانوس سیل میں واپس بھیج دیں گے۔ فرار کے حوالے سے اِس سیل میں بہت روشن امکانات موجود تھے، ایک تو یہ کہ یہ سیل زمین پر واقع تھا، دوسرا اس کے پہلو میں ایک ایسا راستہ تھا جو شاذ ہی کبھی استعمال میں لایا جاتا ہو، علاوہ ازیں نمی کے کارن اس کی دیواریں اتنی خستہ تھیں کہ خود بخود دل میں انہیں دھکا لگا کر گرانے کی رغبت محسوس ہوتی تھی۔ تمہیں صرف ایک ایسا ہتھیار درکار تھا جس کی مدد سے اس میں سوراخ کیا جا سکے اور پھر کوئی ایسی شے بھی جسے کام میں لا کر بتدریج چوڑے ہوتے ہوئے سوراخ کو ڈھکا جا سکے اور کوئی ایسی صورت بھی دریافت کرنا تھی جس کے ذریعے ملبے کو ٹھکانے لگایا جا سکے۔ خیر یہ تو تمہیں سمجھ میں آ چکا تھا کہ فلش ٹائلٹ کے ذریعے فاضل مٹی گارا سے نجات مل سکتی ہے۔ ادھر وہ فلش ٹائلٹ لگانے میں مصروف تھے اور تمہیں اندازہ ہو گیا کہ گوہر مقصود تک تمہارا سفر آدھے سے زیادہ طے ہو چکا ہے۔ اب تم زاکاراکس (Zakarakis) سے کھل کر ہنسی مذاق بھی کر لیتے تھے، ''او پاپاڈوپولکی (Papadopoulaki) وہ تمہاری مسور کی پھلیاں والی پسندیدہ ڈش کدھر گئی؟'' ''ارے بھئی آج تو وہ نہیں پکی، البتہ مرغ کی کچھ بوٹیاں حاضر کروں۔'' ''اوہ ہو، مرغا ہے تو پھر کبھی سہی!'' دریں اثنا تم دیگر اہم مسائل پر غور و فکر میں مصروف تھے، سب سے پہلے تو یہ کہ تمہیں دیوار میں سوراخ کرنے کا ہتھیار کیسے ملے گا؟ تمہارے پاس تو کوئی کانٹا بھی میسر نہیں تھا، البتہ کھانا دیتے ہوئے، وہ تمہیں ایک چمچ ضرور مہیا کرتے تھے اور ___ ہاں چمچ کام دے گا۔ تمہیں اور کیا چاہیے تھا، ایک کدال اور ایک برما؟ تم نے چمچ کو اپنی چارپائی کے نیچے چھپا دیا اور جب محافظوں نے اُسے تلاش کرتے ہوئے تم سے پوچھا تو تم نے اپنے کندھے اچکائے، ''مجھے تمہارے اُس ڈیل چمچ کا کیا علم؟ خود تم میں سے ہی کوئی اُسے اُٹھا لے گیا ہوگا۔'' پھر تم نے اُس چمچ کی مدد سے دیوار کو کھرچا، اُس نے واقعی کام دکھا دیا اور بوسیدہ پلاسٹر فوراً ہی اُکھڑ گیا اور یہ بات تو تمہارے تصور سے بھی باہر تھی کہ دیوار کی بوسیدہ اینٹیں بھی ریزہ ریزہ ہو رہی تھیں، تم نے ڈبل روٹی کے نرم ٹکڑوں کی مدد سے دیوار کی مرمت کی لیکن زیادہ گھمبیر مسئلہ دیوار میں ہونے والے سوراخ کو چھپانے کا تھا اور اس کے لیے تمہیں ایک عدد پردہ درکار تھا لیکن پردے کے لیے اگر تم درخواست دو تو اس کا جواز کیا گھڑو گے اور اس کے حصول کے لیے کسی حکمت عملی اور حربے سے کام لو گے؟ بھوک ہڑتال، نہیں بالکل نہیں، اگر اس ہتھیار کو کثرت سے استعمال کیا جائے، تو یہ تو اسے کُند کر کے ضائع کرنے کے مترادف تھا۔ شاید کوئی دھمکی! کوئی بلیک میل، ہاں یہ بالکل ٹھیک ہے۔ جب وہ تمہارا مطالبہ پورا ہونے کے بعد تم سے اظہار تشکر کی وصولی کے لیے تمہارے پاس آئے تو تب تم اُسے بلیک میل کرو گے۔ وہ آیا ''تم خوش ہو نا؟ تمہیں اپنا فلش ٹائلٹ پسند آیا؟'' ''ہاں یہ تو بہت اچھا ہے، مگر

یہاں پردے کی کمی ہے۔'' ''کون سا پردہ؟'' ''حیا کے لیی پردہ، حجاب، اب جب کہ میرے پاس فلش ٹائلٹ کی سہولت موجود ہے، تو تم مجھ سے اس امر کی توقع نہ کرو کہ جب میں حوائج ضروریہ سے فارغ ہو رہا ہوں تو لوگ مجھے اس حالت میں کھڑکی کے سوراخ کے ذریعے دیکھیں۔'' ''جب تم حوائج ضروریہ سے فارغ ہو رہے ہوتے ہو، تو کھڑکی کے سوراخ میں سے کون تمہیں جھانکتا ہے؟'' ''سبھی اور اُن میں تم بھی شامل ہو۔'' ''میں؟'' ''بالکل زاکاراکس میرے آگے زیادہ شاطر بننے کی کوشش نہ کرو، میں نے خود تمہیں بارہا یہ گندی حرکت کرتے ہوئے دیکھا ہے۔'' ''آلیکاس، خنزیر، حرامی الدہر!'' ''اگر تم اس طرح میری بے عزتی کرتے رہو گے تو پھر میں سب کو تمہاری اس حرکت سے آگاہ کر دوں گا۔'' ''کیا بتاؤ گے، بلیک میلر کہیں کے؟'' ''میں کوئی بلیک میلر نہیں ہوں، بات صرف اتنی ہے کہ مجھ میں حیا شرم ہے کیا یہ قصور ہے کہ میں حیادار ہوں یا قدرتی طور پر میرا مزاج ایسا ہے کہ میں جلد شرما جاتا ہوں؟ علاوہ ازیں پردے سے یہ جگہ بھی بہتر دکھائی دینے لگے گی۔ یہاں پر تو میرے پاس میز اور کُرسی تک کی معمولی سہولت بھی نہیں۔'' ''اچھا، اب مجھے پتہ چلا کہ تم اپنے کمرے کی آرائش کرنا چاہتے ہو اور میں تم پر ثابت کر دوں گا کہ میں کس قدر کشادہ ظرف انسان ہوں اور میرا دل کتنا بڑا ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا، میں تمہیں کرسی اور میز مہیا کر دوں گا۔'' ''اور ایک پردہ۔'' ''پردہ، کیسا پردہ، پردہ گیا جہنم میں، میں تمہارے لیے پردہ کہاں سے لاؤں؟'' بلیک میل سے کام نہ چلا اور نہ ہی منت سماجت کا اُس پر کوئی اثر ہوا۔ ''زاکاراکس (Zakarakis) براہِ کرم مجھے ایک پردہ لا دو۔'' ''کوئی پردہ وردہ نہیں ہے میرے پاس۔'' ''مجھے کوئی پھٹا پرانا کپڑا یا چادر ہی لا دو اور ساتھ ہی دو کیل کہ میں اُنہیں ٹھونک کر اس سے پردے کا کام لے سکوں۔'' ''نہیں، ہرگز نہیں'' ''مگر کیوں نہیں؟'' ''اس لیے کہ یہاں کوئی فیصلہ کرنا میرا کام ہے، سمجھے؟ یہاں میرا حکم چلتا ہے، سمجھے؟ اگر میں سارا وقت تمہارے مطالبات پر ہی دھیان دیتا رہوں تو پھر بہت جلد وہ وقت آ جائے گا جب اس جیل خانے کے کمانڈنٹ تم بن جاؤ گے۔ بہت برداشت کیں میں نے تمہاری ہر طرح کی خرافات، اب میں تمہارے مطالبات سے تنگ آ گیا ہوں۔ میں نے تمہیں میز کرسی بھی دی، لیکن پردہ، میں تمہیں یہ پردہ ہرگز نہیں دوں گا۔'' ''اگر تم مجھے پردہ دے دو تو میں تمہیں کرسی اور میز لوٹا دوں گا۔'' ''نہیں یہ قاعدے اور قانون کا سوال ہے اور اس کے علاوہ یہ کہ تم بالکل پاگل ہو۔'' پاگل ___ بالکل ٹھیک ہے، یہی اس مسئلہ کا واحد حل تھا، تم اُسے یہ باور کراؤ گے کہ تم ایک پاگل ہو اور وہ تمہاری کچھ نہ کچھ دلجوئی کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ اُس شام تم نے اُس وقت تک انتظار کیا جب تک کہ وہ سونے کے لیے اپنے بستر پر نہ چلا گیا۔ پھر تم میز کو گھسیٹ کر کھڑکی کے قریب لائے، میز پر کُرسی رکھی اور سیل کی آہنی سلاخوں سے لٹک کر زور سے چلائے: ''زاکاراکس (Zakarakis) سو گئے ہو، اوزاکاراکس؟ تمہیں اس وقت سونا نہیں چاہیے، اُٹھو اور میرے لیے پردے سیو! مجھے ایک جھالر لگا نیلا پردہ چاہیے!'' یا ''ابے او، تم نے میرا پردہ سی لیا ہے؟ جھالر لگائی ہے؟'' یہ سلسلہ تین سے پانچ راتوں تک یونہی چلتا رہا، بالآخر دوسرے قیدیوں نے عاجز آ کر شکایت کی ''کمانڈنٹ، خدارا پردہ اُس کے حوالے کر دو، ہمیں اُس کی وجہ سے نیند کا ایک

جھونکا بھی نہیں آتا، ہم پر ہی رحم کھاؤ۔'' چھٹی رات اُس کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا، غصے میں آگ بگولا وہ مسلح محافظوں کے ہمراہ تمہارے سیل میں گُھس آیا اور جی بھر کر تمہاری ٹھکائی کی لیکن اس ساری مار پیٹ کے بعد تمہیں ایک مخملیں جھالر لگا نیلا پردہ مل گیا۔ اب تم اپنے منصوبہ پر عمل درآمد شروع کر سکتے تھے اور تم نے بلاتکان دن رات اپنا کام شروع کر دیا۔ جب چیچ دوہرا ہو جاتا، تو تم اپنے ہاتھوں سے دیوار کھرچنا شروع کر دیتے۔ تمہاری سبھی انگلیاں چھِل چکی تھیں اور اُن سے لہو رستا تھا لیکن تمہیں ذرہ برابر درد نہ محسوس ہوتا۔ دیوار میں سوراخ کا قطر پینتالیس (۴۵) سینٹی میٹر تک ہو گیا تھا اور اسے دیکھ کر درد ختم کرنے والی سرخوشی محسوس ہوتی۔ تم دل کھول کر اپنے پسندیدہ گیت گاتے، سیٹیاں بجاتے اور قہقہے لگاتے۔ بالخصوص جب تم دیوار کا کوڑ کباڑ ٹائلٹ سیٹ میں پھینک کر اسے فلش کرتے تو تب بھی تم اس امر سے قطعاً بے پرواہ رہتے کہ اس سے انہیں تمہاری کارروائی کے بارے میں شک و شبہ پیدا ہو سکتا تھا اور جب زاکاراکس (Zakarakis) ماتھے پر تیوری چڑھائے تمہارے سامنے آیا، تب بھی تم پُرسکون اور شانت رہے اور اُس نے تم سے کہا ''ابے یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا تم بیمار ہو؟ دست لگے ہیں کہ پیچش؟'' ''مجھے؟ بالکل نہیں، چنگا بھلا ہوں، پر تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟'' ''تم یہ ٹائلٹ میں ہر وقت پانی کیوں بہاتے رہتے ہو؟'' ''مجھے فلش چلانے میں مزہ آتا ہے۔ اس پر کوئی پابندی لگی ہے کیا؟'' ''نہیں یہ ممنوع تو نہیں ہے۔'' لیکن اس کی خنزیر آنکھ میں تفہیم کی بجلی کوندتی تھی اور بالآخر وہ دن آ ہی گیا، جب دیوار کے باقی ماندہ حصہ کی موٹائی محض دو یا تین سینٹی میٹر رہ گئی تھی۔ بس گرتی ہوئی دیوار پر چند اور ضربیں اور تم بآسانی اس سوراخ میں سے نکل سکتے تھے۔ تمہیں بس اب اس سہانی رات کے پڑنے کا انتظار تھا۔ تم نے اطمینان کی ایک سانس بھری اور چارپائی پر دراز ہو لیے۔ اب تم ایک دن سینے میں تھے۔ جب تم یہاں سے نکلو گے، تو کیا تمہارے لیے دائیں مڑنا بہتر رہے گا یا بائیں جانب؟ بائیں جانب جیل کا کچن اور زاکاراکس (Zakarakis) کا رہائشی کوارٹر تھا۔ دائیں جانب سے نکلنا ہی بہتر ہوگا۔ ویسے تو یہ بالکل ٹھیک ہے لیکن تم سنتریوں سے کیسے منٹو گے؟ خیر سنتریوں اور محافظوں کا مسئلہ تو حل کیا جا سکتا ہے، موراکس (Morakis) کے ہمراہ جیل سے فرار میں تمہیں اس کا تجربہ حاصل ہو چکا تھا اور بیرونی دیوار بھی اُسی طرح پھلانگی جا سکتی تھی مگر اس بار تمہیں اسے اکیلے ہی پار کرنا ہوگا۔ قسمت نے اب تک ہمیشہ تمہارا ساتھ دیا تھا اور اس ضمن میں تو زاکاراکس (Zakarakis) کی ذات تمہارے لیے ایک اچھا شگون تھی۔ بے چارہ زاکاراکس (Zakarakis) جس نے تمہاری خدمت میں مقدس تسبیح اور مسور کی پھلیاں کی لذیز ڈش پیش کی تھی، اُسی نے تمہیں فلش ٹائلٹ لگوا کر دیا تھا اور مخملیں جھالر والے نیلے پردے مہیا کیے تھے، لیکن تم اُس کے ''احسانات'' فراموش کر کے اُس کی حماقتوں سے فائدہ اُٹھانے جا رہے تھے لیکن کیا تم یہ کہنے میں حق بجانب تھے کہ ایسے کردار ہی آمریت کا سبب ہیں اور نہ صرف اس فسطائیت کو مستحکم رکھتے ہیں بلکہ اسے فروغ بھی دیتے ہیں؟ جب تم اس مسئلہ پر زیادہ گہرائی سے سوچ بچار کرتے، تو تمہیں محسوس ہوتا کہ وہ تو آمریت کا اولیں نشانہ ہیں۔ زاکاراکس (Zakarakis) تو درحقیقت خود ایک قیدی تھا، بے عزتی اور

ذلتوں کا نشاں، وہ ہمیشہ بریگیڈیئر جنرل آئیونیڈیز (Ioannidis) اور وزارت انصاف وامن عامہ کے رحم وکرم پر ہوتا، وہ ہمیشہ ایک شدید خوف وہراس کی زد میں رہتا۔ اُن لوگوں کا خوف جو آج اُس کے آقا تھا اور مستقبل میں آنے والے آقاؤں کا خوف، تم اُسے بتانا چاہتے تھے کہ تم حقیقت میں اُس کے خلاف قطعاً نہ تھے۔ تم تو اُسے بھی ایک مظلوم قیدی تصور کرتے تھے۔ تم اُسے بھی اس ظلم سے بچانا چاہتے تھے اور اُس کے سامنے یہ امر واضح کرنا چاہتے تھے کہ تم پر یا تم جیسے دوسرے افراد پر کوڑے برسا کر دراصل وہ خود کو اذیت دیتا تھا، وہ بھی ایک مرد ہو سکتا تھا، کوئی چاکر اور غلام نہیں بلکہ ایک آزاد اور غیر تابع فرماں انسان، مگر اب اُسے یہ سب کچھ بتانے کے لیے تمہارے پاس کوئی وقت نہ بچا تھا اور جب تم اِن سوچوں میں گم تھے تو یکا یک زاکاراکس (Zakarakis) تمہارے سیل کے اندر آیا۔ وہ بے حد پژمردہ اور تھکا ہوا دکھائی دے رہا تھا اور اُس نے انتہائی نرم لہجے میں تم سے کہا ''آلیکاس، مجھ پر ایک کرم کرو۔'' ''کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے؟'' ''آج شام سے میری طبیعت بہت ماندی ہے اور آج رات میں آرام کرنا چاہتا ہوں، براہِ کرم آج غل غپاڑہ نہ کرنا اور نہ ہی غیر ضروری طور پر فلش کو استعمال کرنا'' ''ٹھیک ہے، زاکاراکس ایسے ہی ہوگا۔'' ''واقعی، تم وعدہ کرتے ہو؟'' ''ہاں، میں وعدہ کرتا ہوں کہ آج کی رات میں تمہیں بالکل پریشان نہیں کروں گا۔'' ''میں جانتا ہوں کہ تم نے یہاں میری وجہ سے بہت کچھ بھگتا، تمہارا صیاد جو ٹھہرا۔'' ''نہیں زاکاراکس مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں اور نہ ہی تم میرے جیل اندر ہونے کا سبب ہو۔ میں تو صرف تمہارے آقاؤں کا مخالف ہوں۔ تم تو خود ایک چاکر ہو، اُن کی خدمت پر مامور، خود بھی ایک زندانی، پیٹسورو کوس (Patsourkos) کی مانند اور جیل خانوں کے بارے میں وارڈن خود بھی قیدی ہوتے ہیں چاہے وہ آمرانہ حکومت میں کام کر رہے ہوں یا عام حالات میں۔ اگر کبھی یہ دیس آزاد ہوا اور یہاں حقیقی جمہوریت بحال ہوئی تو تمہیں میرے دلائل بھی سمجھ آنے لگیں گے اور تم میرے موجودہ کردار کی تفہیم بھی بہتر طور پر کرنے لگو گے تم سب لوگ بُزدل ہو اور خود دشمن، مگر اس میں تمہارا کوئی دوش نہیں۔ گناہ گار اور دوشی تو یہاں کی فوجی جنتا ہے۔ جس کے لیے آئین اور قانون محض کاغذ کا ایک چیتھڑا ہے۔ اُن کے تمام احکام غیر قانونی ہیں۔ ظالم اور سفاک یہ لوگ ہیں، تم نہ تو ظالم ہو نہ ہی سفاک، تم تو محض ایک کودن ہو، ایک کودنِ مطلق۔'' زاکاراکس (Zakarakis) تمہارے تبصرے پر ایک عجیب انداز میں مسکرایا، یہ قریب قریب وہی مسکراہٹ تھی، جب ایک صبح اُس نے تم سے پوچھا کہ تمہیں کہیں پیچش کا مرض لاحق تو نہیں ہو گیا۔ تب تم نے اُس بات کو نظر انداز کر دیا تھا لیکن اس بار تم نے اُس کی بات اور مسکراہٹ پر دھیان دیا۔ پوری صورت حال کے بارے میں تم ایک دھدائک گھاؤ کے ساتھ خبردار ہوئے، لیکن اب کسی پیشگی احتیاط یا دوسرے خیال کا وقت باقی نہ بچا تھا۔ گہری تر ہوتی ہوئی رات نے تمہارے اضطراب کو مسترد کر دیا، تم نے دیوار کے سوراخ کی جانب نگاہیں جمائیں اور سارے میں خاموشی چھانے کا انتظار کیا۔

رات گیارہ بجے کے قریب تم نے دیوار کے باقی ماندہ حصہ پر دو ضربیں لگائیں اور اُس پر اپنی کہنی کے بل پر دباؤ دیا۔ دیوار کا وہ حصہ بآسانی گر گیا۔ اب وہاں ایک سوراخ نظر آ رہا تھا۔ تم نے اُس

سوراخ میں سے سر نکال کر باہر دیکھا۔ جہاں تک تمہاری نگاہ گئی، راستہ بظاہر سنسان نظر آ رہا تھا، تم نے کسی طرح کی آواز یا آہٹ کے لیے کان کھڑے کیے، تمہیں کوئی آہٹ تک نہ سنائی دی۔ دونوں اطراف میں راستہ بالکل صاف تھا۔ تم نے اپنا سانس بند کر کے سوراخ میں سے اپنا سر نکالا، پھر ایک بازو اور کندھ اسمیت آگے بڑھنے کے لیے زور لگایا تا کہ دوسرا کندھا اور بازو بھی اس میں سے نکل سکے مگر تم وہاں پھنس کر رہ گئے۔ غالباً تم نے سوراخ کی چوڑائی کا اندازہ غلط لگایا تھا؟ مگر نہیں اس کی وجہ تمہارا بھاری لباس تھا۔ اونی قمیض، اوپر بھاری اونی سویٹر اور اس سے بھاری چمڑے کی جیکٹ، اگر تم یہ لباس اُتار دو، تو تم بآسانی اس میں سے نکل سکتے ہو۔ سو تم نے لباس اتارا، کپڑوں اور دیگر ضروری اشیا کی گٹھڑی بنا کر باہر دوسری جانب پھینک دی۔ یہ گٹھڑی ہلکی سی پھد کی آواز کے ساتھ نصف میٹر کے فاصلے پر گری تھی۔ صحیح بالکل صحیح، تم نے اپنا سر، ایک بازو اور کندھے کے ساتھ سوراخ میں ڈالا، پھر دوسرا بازو اور کندھا بھی باہر سرکایا، اپنے پیٹ کو گھسیٹ کر آگے بڑھے۔ اب تمہارے پاؤں سوراخ کے ایک جانب اٹکے، تا کہ تم ذرا اور پھسل کر باہر نکل سکو، اور ____ عین اُسی سمے ایک کھٹکے کی آواز نے گویا تمہارے کان کے پردوں کو چھید دیا اور پھر ایک استہزائی صدا اُبھری ''باہر تو بہت ہی سردی ہے، آلیکاس، تم بغیر کپڑوں کے یہاں کیا کر رہے ہو؟ وہ تمہاری عفت وعصمت کیا ہوئی؟ کہاں گئی تیری شرم وحیا؟'' زاکاراکس (Zakarakis) تقریباً بیس (۲۰) مسلح فوجی سپاہیوں کے ہمراہ اُس راستے پر کھڑا تھا۔ وہ قہقہوں پر قہقہے لگا رہا تھا۔ فوجی سپاہی بھی ہنس رہے تھے۔ اُن کے قہقہے اتنے شدید تھے کہ اُن کے ہاتھوں میں تھمی رائفلیں یوں تھرا رہی تھیں، جیسے طوفان بادوباراں میں درختوں کی شاخیں لہراتی ہیں۔

''اور تمہارا خیال تھا کہ میں کودن ہوں، کیوں؟ اور تم نے کہا تھا، زاکاراکس (Zakarakis) تم اندھے، بہرے اور ''ہوڑمت'' ہو، کیوں؟ تمہارا خیال تھا کہ پردے کے پیچھے کھرچنے کی آوازوں اور ٹائلٹ میں بے تحاشہ پانی بہانے کی آوازوں سے میں کچھ نہ سمجھا تھا؟ تم انتہائی خود پسند اور واہیات ہو۔ احمق مسخرے! تمہیں پتہ ہے کہ میں نے تمہیں یہ حرکت کیوں کرنے دی؟ اس لیے کہ اس مصروفیت کی وجہ سے تم نے مجھے تنگ کرنا بند کر دیا تھا۔ تم مجرم ہو، ایک عادی مجرم، اور میں تمہیں رنگے ہاتھوں پکڑ کر اپنے لیے تفنن طبع کا سامان فراہم کرنا چاہتا تھا۔'' اور پھر تمہاری چھاتی، چہرے اور جنسی اعضا پر ضربوں کی بوچھاڑ آئی۔ ''اچھا تو میں ایک نکما اور بے حقیقت شخص ہوں؟ ایک غریب ولاچار کودن، اور میں بھی تمہاری مانند یہاں اک قیدی ہوں، احمق اعظم تم نہیں جانتے کہ میں یہاں کا حاکم ہوں، میں ہی چیف ہوں، اصلی چیف اور ایک ذہین وچُست وچالاک چیف! حرامی الدہر میں نے تو اس بات کا بھی حساب لگا رکھا تھا کہ تم یہ حرکت کرنے عرصہ میں کرو گے! اور میں اچھی طرح جانتا تھا کہ تم یہ حرکت آج رات ہی کرو گے! ہم سب کو اس کا علم تھا، ہم سب جانتے تھے، ان سب نے دیوار پر تڑخنے کے نشان کو دیکھ رکھا تھا۔ البتہ تمہیں اس بات کا قطعی اندازہ نہ تھا کہ دیوار کے دوسری جانب بھی یہ نشانات ظاہر ہو چکے ہیں؟'' ایک بار پھر تمہاری چھاتی، چہرے اور نازک اعضا پر ضربوں کی بوچھاڑ آئی، لیکن اِن سے تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہو رہی تھی۔ یہ تو

شرمساری کا ایک شدید احساس تھا، اُن لفظوں کی گونج کہ جنہوں نے تمہارے کان کے پردے چھید دیئے تھے، وہ وقت جب تمہارا نصف جسم سیل کے اندر اور نصف اُس سے باہر تھا، تب تم نے اپنی نگاہیں اُٹھائیں اور فوجی سپاہیوں کو راستے کے ایک طرف منظّم قطار باندھے دیکھا اور اُس شخص نے تمہارا تمسخر اُڑاتے ہوئے کہا ''آلیکاس، باہر تو بہت ہی سردی ہے اور تم کپڑوں کے بغیر یہاں کیا کر رہے ہو؟'' تمہیں محسوس ہوا کہ شرم سے تمہارے گال عنابی پڑ رہے تھے، تمہارا جی چاہا کہ اس سے تو بہتر ہی تھا کہ تمہیں فوراً موت آجاتی، اوخدا، میرے خداوند، اوخدا! یہ کیا ہوا، بدترین تشدد، میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جاتے بالکل روا، یہ ہوتا ہے اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں مگر یوں میرا مضحکہ اُڑانا نہیں یہ کسی صورت قابل قبول نہیں، یہ صریحاً غیر انسانی سلوک ہے۔ ''تو واقعی تمہارا خیال یہی تھا کہ میں خواب خرگوش کے مزے لینے گیا ہوں اور اپنے بستر پر نرم، نرم اور گرم ہوں اور وہاں لیٹا تمہاری یاوہ گوئی اور ہرزہ سرائی پر گہری سوچ بچار کر رہا ہوں؟ تمہیں علم ہے کہ میں اپنے مسلح محافظوں کے ساتھ کتنے گھنٹوں سے تمہارا منتظر تھا؟ تین گھنٹے! پورے تین گھنٹے سے۔'' تمہارے سوجے ہوئے پپوٹے، اُس کی حقارت اور نفرت سے بھری متکبرانہ گھورتی ہوئی آنکھوں کی جانب اُٹھے، تمہارے گھائل اور سوجے ہوئے ہونٹ بے پناہ کاوش سے ہی حرکت کر سکتے تھے۔ ''زاکاراکس (Zakarakis) تم نے جو کچھ کیا ہے، اس سب کے لیے تمہیں ادائیگی کرنا ہوگی، مجھے یہ تو ابھی علم نہیں کہ یہ کیسے ممکن ہوگا، لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم اس سب کے لیے ادائیگی مع سود کے کرو گے۔ میں تمہیں اعصابی خلجان میں مبتلا کر دوں گا اور میں تمہیں پاگل خانے بھجوا کر دم لوں گا۔'' اُس نے تمہاری دھمکی کا جواب ایک آخری زوردار ٹھوکر لگا کر دیا۔ پھر تمہیں مارتے مارتے بے حال ہو کر اور سخت سردی میں پسینے سے شرابور، اُس نے تمہیں ای۔ایس۔اے کے کارندوں کے حوالے کر دیا جو تمہیں ایک کمبل میں لپیٹ کر ایک بار پھر گاوڈی (Goudi) کے فوجی کیمپ میں لے آئے۔ وہاں معمول کی تفتیش شروع ہوگئی۔ وہی بہیمانہ ذہنی اور جسمانی تشدد اور وہی شناسا کردار لوٹ آئے، میجر مالیوس (Malios)، انسپکٹر بابالس (Babalis)، میجر تھیوفلیوانکوس (Theophiloiannakos) اور بریگیڈیئر جنرل آئیونیڈیز (Ioannidis)۔ بہارا بھی کوسوں دُور تھی مگر کھُل گئے تھے نئے سرے سے عذاب سارے۔''

☆☆☆

ڈاکٹر شگفتہ حسین

کتب پر تبصرے

''جہات'' از ڈاکٹر محمد علی صدیقی

کبھی کسی بڑے نے نصیحت کی تھی کہ جب کسی مصنف کی تصنیف کا جائزہ لو تو اُسے دشمن کی نظر سے دیکھنا ___ 'جہات' کو بھی دشمن کی نظر سے دیکھا لیکن آخر اس سے دوستی کرتے ہی بنی۔ 'جہات' ڈاکٹر محمد علی صدیقی کے مضامین کا مجموعہ ___ ان کی ہمہ جہت شخصیت کی خوبصورت تصویر ہے ___ اسم صفت کا استعمال اکثر موصوف کو مشکوک بنا دیتا ہے سو اس رسم بد سے ذرا پرے پرے رہتے ہوئے کہنا یہ ہے کہ ادب کی دنیا میں ڈاکٹر صاحب کی شخصیت اب محتاج تعارف نہیں۔ وہ صرف پاکستان ہی میں نہیں بیرونی ممالک میں بھی اپنے ترقی پسند افکار سے قلوب و اذہان کو تسخیر کرنے میں مصروف ہیں۔ انہی روشن خیال ڈاکٹر محمد علی صدیقی سے ایک بار پھر ہماری ملاقات 'جہات' میں ہوتی ہے۔

وہ لوگ جنہوں نے ڈاکٹر صاحب کو سُنا ہے انہیں یقیناً ان کی تحریر میں بھی گفتگو کی یہی چاشنی محسوس ہوگی ___ دھیمے دھیمے بہتا لفظوں کا دریا جو آپ کو اپنے بہاؤ میں لیے چلا جاتا ہے اور آپ اس میں ڈوب ڈوب کر ابھرتے رہتے ہیں۔ جہات کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں متفرق موضوعات پر اہم ادبی و غیر ادبی مضامین ہیں جن میں اکثر مابعد جدیدیت اور نئے عالمی نظام کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ صدیقی صاحب مابعد جدیدیت کو قابل قبول سمجھتے ہیں کہ یہ نقطۂ نظر کی واپسی کا اعلان کرتا ہے لیکن وہ ردِ تشکیل کو رَد کرتے ہیں۔ ان کے کہنے کے مطابق معانی کا Logocentric System خود دریدا کے لیے بُسس کی گانٹھ ہے اس کی بنیاد جس پیراڈائم پر ہے وہ اپنی منطق اور مستقل معانی کے نظام کے ساتھ ختم ہو چکا ہے اور یہ نظام چونکہ متن کی اضافیت پر یقین رکھتا ہے اس لیے اگر الہامی صحائف کو بھی Deconstruct کیا جائے تو کچھ سے کچھ متن جنم لیں گے جو یقیناً مذہب کے لیے ناقابلِ قبول سعی ہوگی۔ وہ ساختیات کو بھی ایک بے معنی معنویت کا گورکھ دھندا قرار دیتے ہیں لیکن ہمارے ناقدین ترقی یافتہ دنیا کے مسترد شدہ ادبی مباحث کو بھی بلا سوچے قبول کر لیتے ہیں اور صدیقی صاحب کو ایسے ہی لوگ ناپسند ہیں۔ اسی طرح انہیں ناقدین ادب کی نئے عالمی نظام سے بے خبری بھی کھلتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس نظام میں پوری دنیا کے لیے ایک معاشی نظام کو نافذ کرنے کی سامراجی سازش تیار ہو رہی ہے۔ W.T.O اور G.A.T.T. کے نئے ضابطے غیر ترقی یافتہ ممالک کو ہمیشہ کے لیے غیر ترقی یافتہ بنا دیں گے۔ ظاہر ہے کہ جو ملک اپنی ملکی مارکیٹ میں بیرونی صنعت کاروں کا مقابلہ نہ کر پائیں گے وہ بیرونی دنیا میں کس طرح مقابلہ

کر سکیں گے۔

یہ لمحۂ فکریہ ہے تیسری دنیا کے ان تمام ممالک کے لیے جو ترقی کی دوڑ میں شامل تو ہونا چاہتے ہیں لیکن سامراجی ہتھ کنڈوں کو سمجھتے نہیں۔ صدیقی صاحب نے ان مسائل کی گھمبیرتا کو واضح کرنے کے ساتھ اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ اس موجودہ عالمی بحران میں ہمیں ایک بار پھر مارکس کو پڑھنے اور اس کی فکر سے آگاہی کی ضرورت ہے کیونکہ امیر ممالک اپنی فاضل پیداوار غریب ممالک میں Dump کر کے غریب ممالک کی زراعت کو تباہ کرنے میں مصروف ہیں اور دوسری طرف تیسری دنیا کے ان غریب ممالک کو یہ اختیار بھی حاصل نہیں کہ وہ اپنے سماجی ڈھانچے میں انقلابی تبدیلیوں کے ذریعے اپنے معاشرہ کی خوابیدہ طاقتوں کو جگا سکیں، لہٰذا جو نیا سیاسی نظام وجود میں آ رہا ہے اس کے اثرات دُور رَس ہیں۔ ایک خوف ناک ثقافتی دُھند چھا رہی ہے اس کے آر پار دیکھنے کے لیے مارکس کے نظریات کو از سرِ نو پڑھنے کی ضرورت ہے۔

جہات میں شامل ایک مضمون 'ادب اور جمہوریت' ہے جو ان کے ترقی پسندانہ نظریات کا ترجمان ہے۔ اپنے پسندیدہ کردار سرسید احمد خان کی طرح وہ بھی دلِ دردمند رکھتے ہیں جو جانتا ہے کہ ایک طرف قومی ادب کو خطرہ ہے، دوسری طرف صحیح جمہوری کلچر کے فروغ میں حائل ہمارا گھناؤنا فیوڈل کردار ہے اور ان پر مستزاد نیا عالمی معاشی نظام ہے جو اپنی مطلق العنانی قائم کر رہا ہے۔ خدشے اس دل دردمند کو دھڑکاتے ہیں تو وہ صرف اُردو ادب ہی نہیں پوری دنیا کے ادیبوں سے جمہوریت اور جمہوری معاشرے کو تحفظ دینے کی اپیل کرتے ہیں۔ سرسید احمد خان کے ذکر سے یاد آیا انہیں جمال الدین افغانی پسند نہیں کہ ایک تو جمال الدین افغانی کی شخصیت میں تضاد بہت ہے، پھر وہ کسی معروضی سائنسی فکر کے مدبر بھی نہیں، چنانچہ اسی لیے کبھی روس اور کبھی برطانیہ کے حامی ہوتے چلے گئے اور تیسرے وہ سرسید کے مشن اور خیالات کا ترجمہ بہت غلط انداز سے کرتے ہوئے انہیں تنقید کا نشانہ بناتے رہے اور یہ سب صدیقی صاحب کو خوش نہیں آتا۔

پہلے حصے کے دیگر مضامین نیاز فتح پوری، پروفیسر کرار حسین، سبطِ حسن، احتشام حسین اور ضمیر نیازی کے بارے میں ہیں۔ یہ تمام اشخاص اپنی اپنی جگہ پر اہمیت کے حامل اور رجحان ساز ہستیوں کا درجہ رکھتے ہیں، انہوں نے ان کے نمایاں اور مضبوط پہلوؤں کو موضوع بنایا ہے۔ اگر پروفیسر کرار حسین روایت سے وابستہ ہیں کہ جو قومیں ماضی کے بغیر مستقبل میں داخل ہونے کی کوشش کرتی ہیں وہ فکری طور پر بانجھ اور غیر تخلیقی ہو جاتی ہیں تو دوسری طرف سبطِ حسن اپنے مارکسی افکار سے پاکستانی سماج میں بیداری کی نئی لہر پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح احتشام حسین کی رائے میں اعلیٰ ادب اور اعلیٰ تنقید کی پہچان یہ ہے کہ اس سے زندگی کے حُسن اور توانائی کو سمجھنے اور اسے اُبھارنے میں مدد ملتی ہے یوں عوام کا رشتہ عوامی جدوجہد کرنے والی طاقتوں کے ساتھ مضبوط ہوتا رہا ہے جب کہ ضمیر نیازی کا رشتہ عوامی جدوجہد کرنے والی انہی طاقتوں کے ساتھ بندھا تھا اور بقول صدیقی صاحب وہ داد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اپنی زندگی کے کربناک لمحوں میں پاکستانی قوم کے ''چوتھے سُتون'' (صحافت) کی دلخراش داستان بڑی جرأت کے

ساتھ رقم کی ہے۔

جہات کا دوسرا حصہ فکشن پر اور تیسرا حصہ شاعری پر تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے۔ فکشن والے مضامین کا موضوع بحث عصمت چغتائی، مستنصر حسین تارڑ، اقبال مجید، آغا سہیل، رتن سنگھ اور کمال مصطفیٰ ہیں جب کہ شاعیر والے مضامین میں میر انیس سے لے کر واحد بشیر تک مختلف مزاج اور مختلف انداز کے ۱۴ شعرا کی تخلیقی سرگرمیوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ صدیقی صاحب کی تنقید کی بنیادی خوبی ہمیشہ سے یہ رہی ہے کہ وہ نظری اور عملی ہر دو تنقید سے نوازتے ہیں اور ان کی کوشش یہی رہتی ہے کہ جس ہستی کو وہ موضوع بنا رہے ہیں اس کی شخصیت اور فن کا وہ پہلو سامنے لائیں جو اب تک ناقدین کی نگاہوں سے اوجھل رہے ہیں۔ بہادر شاہ ظفر کو متاعِ درد کا شاعر قرار دیتے ہیں تو ساتھ ہی اسے ترقی پسند فکر کا حامل بھی ثابت کرتے ہیں جب کہ ناقدین کا رویہ بہادر شاہ کے بارے میں اب تک یہی رہا ہے کہ وہ ایک زوال پذیر سلطنت کا بے بس اور مجہول بادشاہ تھا۔ اسی طرح ایک اور مضمون میں انہوں نے راشد اور اقبال کی مشترکہ دنیا دریافت کی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ ان دونوں کے ہاں ہیئت اور مواد کے فرق کے باوجود ایک ایسی قوتِ محرکہ کارفرما نظر آتی ہے جو ہماری قوم کو روحانی اور مادی طور پر آزاد زندہ انسانوں کی جمعیت میں بدل سکتی تھی۔ فکشن اور شاعری پر لکھے یہ تنقیدی بصیرت افروز مضامین پڑھنے والوں کے لیے نئی راہیں متعین کرنے کے علاوہ ان میں کھوج اور جستجو کی حِس بھی جگاتے ہیں۔ جہات کا آخری مضمون ''پاکستانی مصوری کی بیگانہ روی' کے عنوان سے ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے اس امر کی نشان دہی کی ہے کہ ہمارے اکثر مصور مغرب کی نقالی میں مصروف ہیں اور اس لیے صرف چند ایک مصوروں کو ہی صاحب اُسلوب فن کار کہا جا سکتا ہے۔

ماہنامہ ''سپوتنک'' لاہور: (مئی ۲۰۰۴ء)

ماہنامہ سپوتنک آغا امیر حسین کی زیرِ ادارت لاہور سے شائع ہوتا ہے اور ''ہر شمارہ ایک مکمل کتاب'' کا دعوے دار ہے۔ میں نے سپوتنک کے دیگر شمارے نہیں دیکھے ہیں اس لیے یہ تو معلوم نہیں کہ ہر شمارہ کو ایک مکمل کتاب کی صورت میں کیسے ڈھالا جاتا ہے، موضوع کے اعتبار سے، صنف کے، مصنف کے اعتبار سے، لیکن مئی ۲۰۰۴ء کا شمارہ ڈاکٹر خیال امروہوی نمبر ہے۔ کہکشاں در کہکشاں کے عنوان سے ڈاکٹر خیال کے ادبی، تنقیدی اور مبصرانہ مضامین کی کہکشاں سجی ہے۔

ایسے معاشرے جہاں سیاسی، سماجی جبر اس طرح مسلط ہو کہ اس کا چہرہ مسخ ہو کر رہ جائے وہاں خیال امروہوی جیسے روشن خیال، روشن فکر، انسانی اُمیدوں کو ایک نئے دن کی نوید دینے والوں کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر خیال اچھے مارکسی شاعر ہی نہیں، اچھے مارکسی نقاد بھی ہیں۔ سوشلزم پر ان کی گہری نظر ہے۔ مضامین ''عصرِ حاضر کا فکری اور ادبی تناظر''، ''جوش (مارکسی فکر کی روشنی میں)'' اور ''تنقیدی

وضاحتیں'' ان کے ترقی پسند نقطۂ نظر کی وضاحت ہیں۔ وہ موجودہ صدی کو سوشلزم کی صدی قرار دیتے ہیں کہ آج جب کہ معاشرے بھڑک رہے ہیں اور بھوک نے انسانی نسلوں کی ہڈیاں چٹخا دی ہیں ہمیں سوشلزم اور مارکسزم کی ازحد ضرورت ہے مارکسزم کو عام طور پر محض معاشی نظام کی بحث سمجھا جاتا ہے جب کہ یہ ایک پورا فلسفہ ہے، زندگی کے حسن، صداقت اور انسان دوستی کا۔ ڈاکٹر صاحب نے جوش کے کلام کا مارکسی فکر کی روشنی میں جائزہ لیتے ہوئے اسی امر کی وضاحت کی ہے کہ وہ جوش کو فیض، ساحر یا کیفی اعظمی ثابت کرنے کے بجائے یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ وہ انسان دوست ہے۔ اس کے ہاں حسنِ فطرت کے ساتھ انسانی جمال کی بھرپور تعریف بھی ہے اور انسانی شرفِ درد وغم بھی۔ وہ سابقہ روایتی فرسودہ افکار وعقاید کی عمارت مسمار کر کے نئی دنیا آباد کرنے کی نوید سناتا ہے۔

وہ برٹرینڈ رسل کا محاکمہ کرتے ہیں، یہ بتانے کے لیے نہیں کہ وہ دانش ور نہیں یا اس کا علمی، تمدنی اور سماجی اُفق دھندلا پڑ گیا تھا بلکہ وہ یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ وہ ایک بے چین روح تھا جو اس پراسرار کائنات میں ایک منتشر الخیال تمدنی زندگی کو پسند نہیں کرتا اور اسی لیے تنقید کرتا ہے۔ وہ علی عباس جلال پوری کے ساتھ علمی مطالعے کا سفر بھی طے کرتے ہیں، مارکس کو بحیثیت فلسفی پیش کرنے کی 'گریز' (اکثر مارکس ان کی تشبیب اور گریز دونوں ہوتا ہے) سے اپنے ممدوح کی طرف آتے ہیں کہ علی عباس ایسے فلسفی ہیں جو اپنی خردافروزی کو دوسروں پر مسلط کرنے کے شوقین نہیں بلکہ وہ اپنے قاری کو ازل سے ابد تک کا سفر خراماں خراماں طے کراتے ہیں۔ اس سفر میں جہاں وہ تاریخ کی تیز وسبک رفتاری کا سامنا کرتا ہے، وہیں انسانی تمدن کو چھوٹے بڑے نظامات میں تبدیل ہوتا دیکھتا ہے۔ علی عباس جلالپوری کی بیشتر تصانیف کا حاصل بقول خیال امروہوی یہ ہے کہ اگر لمحۂ موجود کا ادراک کرنا ہے تو ماضی کا بھی بہ نظر غائر مطالعہ لازم ہے اور شاید اسی لیے انہوں نے اپنے ایک مضمون ''حاکمیت عقل'' میں، جو انہوں نے فارسی میں تحریر کیا اور جسے پروفیسر محمد اقبال خان نے اُردو میں ترجمہ کیا ہے، قاری کو ڈسکارٹس کے علمی دلائل سے رجوع کراتے ہوئے، ابنِ رشد اور ابوبکر رازی کی عقلیت تک جا پہنچایا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا ایک مضمون اصنافِ سخن کے حوالے سے ہے جس میں انہوں نے غزل اور مرثیہ کا نامیاتی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا ہے۔

صابر آفاقی، نسیم لیہ، دانش ور شاعرہ سمر بلوچ، تنویر سپرا، افضل صفی اور جون ایلیا وغیرہ پر ان کے تنقیدی اور مبصرانہ مضامین ہیں۔ جون ایلیا ہمارے مصنف کے پھوپھی زاد ہیں چنانچہ بڑی وضاحت سے ان کا شجرہ 'نسب سے ادب' تک بیان کیا ہے اور بڑی گہرائی میں جاتے ہوئے ان کے کلام کا خوبصورت تجزیہ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کے علاوہ محسن احسان، محمد اشرف اور ظہیر کاشمیری کو بھی موضوع تحریر بنایا ہے اور ن۔م۔ راشد سے اپنی آخری گفتگو بھی رقم کی ہے جو خاصے کی چیز ہے۔

سپوتنک کے اس شمارے میں آغا امیر حسین کے سفرنامے 'اے۔ جے۔ کے۔ لندن' پر سیر حاصل تبصرے اور ذوالفقار علی بھٹو شہید کی ان تمام کتابوں کی فہرست بھی شامل ہے جو 'کلاسیک' نے

چھاپی ہیں___ بھٹو کی اس تحریر کے ساتھ

"I am not a rootless phenomenon. I am not going to run away from my country. I am not leaving my roots (Bhutto - Supreme Court of Pakistan. Dec. 8-1978).

اور خیال امروہوی صاحب اور مدیر اعلیٰ سپوتنک سے معذرت کے ساتھ یہی تحریر میرے لیے سپوتنک کے اس شمارے کا حاصل ہے۔

بیگم سرفراز اقبال: تالیف وترتیب: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، عاصم کلیار

بیگم سرفراز اقبال سے میرا پہلا تعارف ان کی کتاب ''دامنِ یوسف'' تھی اور دوسرا تعارف ''خامہ بگوش'' (مشفق خواجہ صاحب) کا کالم ''دامنِ یوسف یا دامنِ تارتار'' لیکن بھلا ہو ڈاکٹر سید معین الرحمٰن اور عاصم محمد کلیار کی تالیف وترتیب ''بیگم سرفراز اقبال'' کا جس نے بیگم سرفراز اقبال سے مکمل تعارف کرایا ہے۔

یہ کتاب چار حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ ''طربیہ دھن: کوئے بہاراں سے آئی خوشبو کا سفر''، عاصم محمد کلیار کا تھیسس ہے، یہ حصہ غیر مطبوعہ تحریروں پر مشتمل ہے۔ دوسرا حصہ ''سُر سنگیت: چند اہل کمال کی پرانی تحریریں اور کچھ سرفراز اقبال کی غیر مرتب نگارشات'' ہے۔ تیسرے حصے کا عنوان ''اُجڑی بہار کا ماتم: (مختصر تحریریں) حزنیہ ڈراپ سین'' ہے جب کہ چوتھا حصہ جس میں غیر مطبوعہ تحریریں شامل ہیں ''کس قدر دل نے ان کو یاد کیا: دونسبتاً طویل مطالعے'' ہے۔ ایم اے شعبۂ اُردو کے لیے لکھا گیا یہ مقالہ پروفیسر اصغر ندیم سید کی زیر نگرانی شعبۂ اُردو گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور سے جولائی ۲۰۰۲ء میں مکمل ہوا۔ اس کی تجویز پروفیسر ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے دی تھی جو شعبۂ اُردو کے سربراہ اور بیگم سرفراز کے احباب میں سے ہیں۔

پہلا حصہ تھیسس ہے جس میں تحقیق کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ سرفراز اقبال کا سوانحی خاکہ مرتب کرنے کے ساتھ ان کی دو کتابوں کا مکمل تعارف دیا گیا ہے۔ اس حصے کی اہم بات بعض اہلِ علم کے خطوط کے عکس ہیں۔ ایک عکس صادقین کی خطاطی کا بھی ہے جو مرحومی نے عاصم کلیار کو باکمال مہربانی دیئے تھے۔ باقی تینوں حصوں میں ممتاز لکھنے والوں کی تحریریں ہیں جن میں انہوں نے بیگم سرفراز اقبال کی شخصیت کو سراہا ہے۔ یہ سب لکھنے والے ان کی محبت کے اسیر اور ان کی میزبانی کی حلاوتوں کا ذائقہ دلوں میں بسائے انہیں یاد کرتے ہیں۔ وہ ''محبت کی اسیر اور سفیر صاحب اُسلوب'' تھیں۔ ان کی دو کتابیں منظر عام پر آئیں اور چونکا گئیں۔ بیگم سرفراز گھر کے دروازے کی طرح دل بھی کشادہ رکھتی تھیں اس لیے وہ بہت سے ایسے جملوں کا بھی بُرا نہ مانتی تھیں جو خاصے ذومعنی ہوتے اور جن کا ذکر خطوں، تحریروں یا گفتگو میں ہوتا تھا۔ یہ ان کی معصومیت تھی، محبت تھی، کشادہ دلی تھی کہ وہ سب لوگ جو دنیا کو تہذیب کے کئی

دھاروں سے آشنا کرانے کا فرض انجام دیتے رہے، خود اس آزادمندی کی جل ترنگ سے سیراب ہوتے رہے۔ وہ بڑے بڑے نام جو اُردو ادب کا وقار ہیں، ان کی محبت میں رقابت اور رشک کی آگ میں جلتے رہے۔ گویا یہ اعزاز اب صرف عطیہ فیضی ہی کو نصیب نہیں کہ اقبال اور شبلی کے درمیان رقابت کا سبب بنیں۔ فیض احمد فیض سے سرفراز اقبال کی وابستگی کے بعد احمد فراز، ابنِ انشا، سبطِ حسن، ممتاز مفتی وغیرہ کے رشک و رقابت کے ملے جُلے جذبات نے سرفراز اقبال کو بھی ''ادب کی رانی'' (بقول ممتاز مفتی) بنا دیا۔ ان کی تحریریں کس معیار کی ہیں ہمیں اس سے غرض نہیں لیکن ادبی دنیا کے بہترین دماغوں نے انہیں جس انداز سے سراہا اور چاہا ہے، اس کے بعد اُردو ادب کی تاریخ انہیں کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔ کشور ناہید کے کہنے کے مطابق فرانس کی ایک معروف شخصیت مادام انائس نن کے ہاں ایسی ہی نابغۂ روزگار شخصیت کا مجمع رہتا تھا اور ہمارے زمانے میں یہ اعزاز بیگم سرفراز اقبال کو حاصل ہوا۔ ان سے پہلے یہ سعادت عطیہ فیضی اور بیگم آمنہ مجید ملک کے حصے میں آئی تھی۔ نابغۂ روزگار شخصیات جس گھر میں سکون پاتی ہوں اسے ممتاز مفتی ''راجا بازار کا ٹریفک چوک'' کہیں ___ خدا لگتی کہیں گے ہمیں اچھا نہیں لگا۔

پروفیسر ڈاکٹر معین الرحمٰن کا کہنا بجا ہے کہ ''سرفراز اقبال کی خوبیوں اور مہربانیوں کو بھُلا دینا ممکن نہیں، ان کی یادیں ادب و فن کو عزیز رکھنے والوں کے لیے مستقل ستارۂ سحر اور سرچشمۂ قرار جاں رہیں گی۔'' کتاب کا تعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے ایک جملہ تحریر کیا ہے کہ ''اُمید ہے کہ شعر و ادب کے 'خوش عقل' اور 'خوش شکل' حلقوں میں اس کا خیر مقدم کیا جائے گا۔'' کہنا یہ ہے کہ کتاب تو ہمیں بھی بہت پسند آئی ہے حالانکہ ہم آپ کی دونوں شرائط پر پورے نہیں اُترتے ___ تو پھر یہ صرف 'خوش عقل' اور 'خوش شکل' قارئین کی پسندیدگی کی شرط ہی کیوں ___ ؟؟ یہ کتاب یقیناً تمام ادبی حلقوں میں مقبول ہوگی خصوصاً اس حوالے سے بھی کہ وہ خاتون جو فیض احمد فیض کو بے انتہا عزیز جانتی ہوں اور فیض صاحب بھی جنہیں عزیز رکھتے ہوں ان کے بارے میں جاننے کی خواہش سب کو ہوگی اور یہ کتاب ''بیگم سرفراز اقبال'' کا مکمل تعارف ہے۔

''تخلیقی ادب''، اسلام آباد

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد کا تحقیقی مجلّہ ''دریافت'' اپنے بہترین تحقیقی معیار کی بدولت ادبی دنیا کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے اور اب اس درس گاہ سے ادب کی پنیری لگانے کے عزم کے ساتھ ''تخلیقی ادب'' کا اجراء ہوا ہے۔ اس کے مدیر اعلیٰ بریگیڈیئر (ر) ڈاکٹر عزیز احمد خان ہیں جب کہ مجلس ادارت میں ڈاکٹر رشید امجد اور عابد سیال ہیں اور مجلس مشاورت ڈاکٹر محمد آفتاب احمد، ڈاکٹر گوہر نوشاہی اور پروفیسر رفیق بیگ پر مشتمل ہے۔

''تخلیقی ادب'' کے اس پہلے شمارے کو ترتیب دیتے ہوئے تنقید، افسانہ، نظم، غزل، ترجمہ،

تبصرہ سبھی کو شامل کیا گیا ہے اور خوبی یہ ہے کہ کوئی بھی چیز ایسی نہیں جسے آپ ''بھرتی'' قرار دے سکیں۔ یہ ایک ممتاز درس گاہ کا پرچہ ہے جو اپنے طلبا و طالبات کی تخلیقی سرگرمیوں کو نمایاں کرنے اور ان کی حوصلہ افزائی کے لیے جاری کیا گیا ہے۔ لہٰذا معروف تخلیق کاروں کے ساتھ ریسرچ سکالرز اور طالب علموں کی کاوشیں بھی قارئین کی توجہ کو جذب کرتی ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ''تخلیقی ادب'' کی پنیری (ایم اے اور ایم فل کے طالب علم) اپنی تخلیقات میں ایسی پختہ نظری کا مظاہرہ کر رہی ہے کہ آپ بلا جھجک انہیں ہونہار بروا کہہ سکتے ہیں جب کہ دوسری طرف ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر گوہر نوشاہی، ڈاکٹر نوازش علی، وزیر آغا، تبسم کاشمیری، علی محمد فرشی، وقار بن الٰہی، اعجاز راہی، محمد حمید شاہد، پرتو روہیلہ اور افتخار عارف وغیرہ کی نگارشات ان طالب علموں کے لیے ایسی روشن مثالیں ہیں جو نہ صرف ان کے ذوق علم و ادب کو سیراب کریں گی بلکہ وہ ان سے رہنمائی بھی پائیں گے۔ ہمیں اُمید ہے کہ تخلیقی ادب کے آئندہ کے شمارے میں طالب علموں کی تخلیقات زیادہ سے زیادہ تعداد میں شامل اشاعت ہوں گی اور پرچے کا اعلیٰ معیار بھی برقرار رہے گا۔

''وقت کی فصیل'': محمد حامد سراج

وقت کی فصیل محمد حامد سراج کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ محمد حامد سراج افسانے کی اس روایت سے وابستہ ہیں جہاں سچی حقیقت نگاری کہانی کا وصف ٹھہرتی ہے۔ ان کے ہاں نہ تو علامتوں کا کوئی گورکھ دھندا ہے اور نہ ہی استعاروں کی بھول بھلیاں، سیدھے سادے لفظوں میں معنی کی پرتیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔ وہ اپنے افسانوں کا لینڈ سکیپ اپنی مٹی اپنی زمین سے تراشتے ہیں اور ان کے کردار میری اور آپ کی طرح کے عام سے لوگ ہیں جو تنہائی اور مغائرت کا دکھ بھوگ رہے ہیں۔ مہنگائی کی چکی میں پستے چلاتے ہیں لیکن ان کا دکھ صدا بصحرا ثابت ہوتا ہے۔ ان کے باطن میں چھپا رومانوی انہیں ماضی کی جانب کھینچتا ہے اور کبھی مذہب ان کی پناہ گاہ بنتا ہے۔ مذہب سے یہی وابستگی انہیں انصار مدینہ کے درمیان لا کھڑا کرتی ہے۔ ایک اعتبار سے دیکھا جائے تو ان کا یہ رویہ حالات و واقعات سے فرار کی کیفیت ہے۔ ان کے کرداروں میں حالات کو سہنے کا نہیں سپر ڈالنے کا مادہ ہے۔ شاید یہ بھی ان کی مجبوری ہے کیونکہ زندگی کا کابوسی خواب کبھی کبھی انسان کو اس قدر وحشت زدہ اور سراسیمہ کر دیتا ہے کہ اسے ہتھیار ڈالنے میں عافیت دکھائی دیتی ہے، زندگی کی شوریدسری سے ہار مانتے ان کے کرداروں کے ہاں رومان کی چاشنی یا مسکراہٹوں کی کسی کرن کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ بہرحال ان کے مشاہدے کی گہرائی، کہانی بیان کرنے کی تخلیقی خداداد صلاحیت اور ان کی حساسیت قارئین کو یقیناً متاثر کرے گی۔

☆☆☆

غزلیات

صابر ظفؔر

جس طرف جانے میں لازم جان کا نذرانہ تھا
جانے والا اُس طرف میں آخری دیوانہ تھا

دیکھ کر چپ تھے ستم گر کی غضب ناکی سبھی
دار سے لیکن بُلند اِک نعرۂ مستانہ تھا

کوئی تو ہوگا سبب ، تشنہ رہا میں جو وہاں
آبِ کوثر سے جہاں لبریز ہر پیمانہ تھا

کاش اُس کی مسکراہٹ کی طرح ہوتی حیات
ہر ادا اُس کی غضب تھی ، ہر چلن شاہانہ تھا

کِس روش سے داد پاتا ، خوش خرامی کی ظفؔر
دہر میں جس سمت دیکھا ، سبزۂ بیگانہ تھا

☆☆☆

صابر ظفؔر

کرنا ہے اجل پہ غور ، اچھّا
مر جائیں اگر تو اور اچھّا

سب خوب ہیں دَورِ مَے مگر جو
ہم تک پہنچے وہ دَور اچھّا

سب دوست سُدھر گئے تمہارے
کب ہوگا تمہارا طَور اچھّا

چاہوں تمہیں ایسے دیکھنا میں
جس طرح لگے بلور اچھّا

سمجھوں میں ظفؔر سپھل ہوا پریم
ہو جائے جو وہ کٹھور اچھّا

صابر ظفؔر

محبت کی ہر لہر ہے جاودانی
نہیں کوئی اوّل ، نہیں کوئی ثانی

ہمیں پار جانے کی جلدی نہیں ہے
گزرنا ہے جو ، وہ گزر جائے پانی

تہہِ آب لنگر کی صورت پڑے ہیں
ہمارے ہے کس کام کی یہ روانی

جو تیرے ہیں اُن کا الگ ہے فسانا
جو ڈوبے ہیں اُن کی الگ ہے کہانی

بھنور میں ابھی تک ہیں ہم تو ظفؔر
نہ کوئی ٹھکانا نہ کوئی نشانی

☆☆☆

صابر ظفؔر

ہم پل دو پل یہاں رہیں گے
آگے تو جاوداں رہیں گے

اپنی خلوت ہے سب کی خلوت
ہم سب کے درمیاں رہیں گے

ہر لَو ہر دم بُلند ہوگی
روشن سارے نشاں رہیں گے

وقت اپنا ہمرکاب ہوگا
ہر پل ایسے رواں رہیں گے

سمجھو ہم ساتھ ہیں تمہارے
جب تک یہ آسماں رہیں گے

صابر ظفر

کسی کو بھی کسی کا غم نہیں ہے
یہ جنت ہے یہاں ماتم نہیں ہے

تمنا ہو چکی ہو جیسے پوری
کوئی بھی دیدۂ پُر نم نہیں ہے

یہ سب پریاں ہیں فردوسِ بریں کی
کسی کی زُلف بھی برہم نہیں ہے

ہر اِک پل ہے کسی کے وصل کا پل
کوئی بھی دوسرا عالم نہیں ہے

مقابل آئنوں کے آئنے ہیں
ظفر کوئی بھی نامحرم نہیں ہے

صابر ظفر

صد ناز جو بے حجاب نکلا
تُو نکلا کہ آفتاب نکلا

تعبیر بنا وجود تیرا
جب نیند سے ایک خواب نکلا

سینے سے لگا لیا جو تُو نے
اِس دل سے ہر اضطراب نکلا

جب کونپلیں پھوٹنے لگی تھیں
تُو گُل کی طرح شتاب نکلا

خوش بختی نہیں ظفر تو کیا ہے
دِن ڈھلتے ہی ماہتاب نکلا

☆☆☆

صابر ظفر

مری روح میں مر رہا ہے کوئی
کہ ماتم مرا کر رہا ہے کوئی

اگر میرا دُکھ صرف میرا ہے دُکھ
کہیں آہ کیوں بھر رہا ہے کوئی

اچانک نہیں ہو گیا ملتفت
کہ دل میں تو اکثر رہا ہے کوئی

سلامت ابھی تک جو اندر سے ہوں
نگہبان باہر رہا ہے کوئی

اچانک گری آج دیوارِ دل
کہ دُکھ میرے اندر رہا ہے کوئی

صابر ظفر

آتے ہوئے پل سے آگے جھانکیں
جیسے تجھے ڈھونڈ لیں گی آنکھیں

افلاک کے نیلے آنچلوں پر
ہم تیرے لیے ستارے ٹانکیں

ملبوس ہوں تیرا ، اِس طرح ہم
آنکھوں کو یہ پلکیں جیسے ڈھانکیں

کب تک یہ سفر نہ ختم ہوگا
کب تک یونہی خاک دُھول پھانکیں

سوچوں کا ہے بے مُہار ریوڑ
آؤ اِسے تھوڑی دیر ہانکیں

☆☆☆

صابر ظفر

کوئی یاد تھی دل میں آئی ہوئی
کہ اِک آگ سی تھی لگائی ہوئی

ہمارا تمہارا مقدر بنی
رفاقت کوئی آزمائی ہوئی

محبت میں ایسا مقام آ گیا
مسلّط کسی کی خدائی ہوئی

ہمی کو پنہ لینے دیتی نہیں
عمارت ہماری بنائی ہوئی

ہمارا تمہارا ہوا کب وصال
ہماری تمہاری جدائی ہوئی

☆☆☆

صابر ظفر

جب بھی ہمیں یاد آیئے گا
بس میں ہو تو بھول جایئے گا

ہر رنگ میں ہوں گے رونما ہم
کس کس سے نظر چرایئے گا

سونے کا اگر نہ ہو ارادہ
ہمراہ ہمیں جگایئے گا

ہم آپ کو دیکھ لیں گے چھُو کے
جب تک نہ دیا جلایئے گا

ہم ہوں گے ظفرؔ تو رنگ ہوں گے
بستر پہ دھنک بچھایئے گا

معین تابشؔ

یہ اور بات کہ لہجہ پُر اعتماد نہ تھا
مرے بیان میں لیکن کوئی تضاد نہ تھا

اِسی لیے تو کیا جنگ سے حَذَر میں نے
یہ رنجشِ من و تُو تھی کوئی جہاد نہ تھا

ہے بے حِسی کا یہ عالم کہ میری سوچوں میں
تضادِ دہر میں رہ کر کوئی تضاد نہ تھا

مرے خیال کو وہ ہم رکاب کیا کرتا
جسے خود اپنی مَعیَت پہ اعتماد نہ تھا

مجھے خبر تھی کہ ہوگا مآل سے عاری
وہ اِجتہاد جو دراصل اجتہاد نہ تھا

اُس ازدحام میں قسمت سے میں بھی تھا شامل
جِس ازدحام میں کوئی کسی کے بعد نہ تھا

اب اُس کا ذکر کتابوں میں بھی نہیں تابشؔ
وہ دَور جِس میں کہ کوئی بھی بدنہاد نہ تھا

معین تابشؔ

ہوا ہے قافلۂ درد جب رَواں مرے ساتھ
ہر ایک گام رہا عہدِ بے اَماں مرے ساتھ

شکستگی کے تسلسل کی زد پہ رہ کر بھی
مرے مکان کے ہیں بام و دَر رواں مرے ساتھ

ہوئی ہے رب کی نیابت عطا مجھے پھر بھی
زمیں ساتھ ہے میرے نہ آسماں مرے ساتھ

نشیبِ قعرِ تاسُّف سے کس طرح نکلوں
ہے اب تلک اثرِ سعیِ رائیگاں مرے ساتھ

تری تلاش کا عازم ہوا تو ہوں ، لیکن
یقین پاس ہے میرے نہ ہے گماں مرے ساتھ

میں کیسے مان لُوں تُو ہے مرا شریکِ خیال
ہیں ساتھ تیرے کواکب نہ کہکشاں مرے ساتھ

اگرچہ دہر کے برزخ میں ہوں مگر تابشؔ
ہزار شکر کہ ہیں میرے جسم و جاں مرے ساتھ

☆☆☆

ڈاکٹر خیالؔ امروہوی

جب بھی کہتا ہوں نئے پن سے غزل کہتا ہوں
نوجواں نسل کو ساگر کا کنول کہتا ہوں

میں نے جس شکل سے بھی اپنی گزاری ہے حیات
اس کو پیچیدگیٔ زلف کا بل کہتا ہوں

میری تفہیم کی تردید نہیں ہوسکتی
جو بھی کہتا ہوں بہر طور اٹل کہتا ہوں

دھینگا مشتی نظر آئی جو بنام جمہور
اصطلاحاً میں اسے جنگِ جمل کہتا ہوں

جھاڑ لیتا ہوں فقط اپنا غبار خاطر
کب کہا میں نے کہ اسرار ازل کہتا ہوں

یہ بھی ہے عظمت تعمیر کا خوش رنگ ثبوت
اپنی کٹیا کو ڈھٹائی سے محل کہتا ہوں

ڈاکٹر خیالؔ امروہوی

ارتقائی سوچ کا اونچا علم گرنے نہ دے
ہاتھ کٹ جائیں تو کٹنے دے قلم گرنے نہ دے

میرا تیشہ توڑ دے گا جبر کی اونچی فصیل
تو مجھے اے میری تنہائی کے غم گرنے نہ دے

جتنے پتھر بھی مخالف سے لگیں شکوہ نہ کر
فکر کی سچائی کا طرز رقم گرنے نہ دے

وصفِ تخلیقات کا راز ازل معلوم کر
ہاتھ سے آئینۂ سرّ عدم گرنے نہ دے

میں تو وہ ہوں جس نے گرتوں کو سنبھالا عمر بھر
اب مجھے دشواریوں میں دم بہ دم گرنے نہ دے

گردشِ لمحات کی ہمت شکن یلغار میں
اپنے تخلیقی ہُنر کا کیف وکم گرنے نہ دے

نفرتوں کو دفن کر یہ صلح کُل کا دَور ہے
مندر و بیکل کو رہنے دے حرم گرنے نہ دے

☆☆☆

ڈاکٹر خیالؔ امروہوی

ہے آرزو کہ کبھی حُسنِ دلبراں سے ملیں
شکستہ پائی کے مارے بھی کارواں سے ملیں

مشاہدات سے ہی تجزیئے نکلتے ہیں
انہیں سنبھال کے رکھنا جہاں جہاں سے ملیں

اُسے بتائیں فنا کا نصاب کر تبدیل
شریف لوگ اگر مرگِ ناگہاں سے ملیں

ہر ایک شہر میں بربادیوں کے ڈیرے ہیں
ولادتوں کے صلے اور کیا یہاں سے ملیں

جو دوستوں پہ وفاؤں کے پھول برسائیں
اب ایسے لوگ غلط دور میں کہاں سے ملیں

زماں میں رہ کے بھی جب خود سے ناشناس رہے
تو کیسے خلق کے اسرار لازماں سے ملیں

یہاں لہو بھی ہے اور آتش تعصب بھی
محال ہے کہ جمالِ سمن براں سے ملیں

بلندیوں پہ پہنچنے کی سب کو خواہش ہے
زمیں سے جان چھڑائیں تو آسماں سے ملیں

ڈاکٹر خیالؔ امروہوی

وہ عہد ساز جو رستے نئے نکالتے ہیں
چراغِ عقل سے تاریکیاں اُجالتے ہیں

ہوا کے ہوش رہا بیکراں تلاطم میں
بڑے کمال سے ہم بال و پر سنبھالتے ہیں

وہ جن کو چھین کے لے جاتے ہیں عرب والے
لہو پلا کے انہیں اہل درد پالتے ہیں

یہ کیسا دَور ہے جس میں خدا کے بندوں کو
مویشیوں کی طرح راہبر ہنکالتے ہیں

وہ لوگ جم کے لڑیں کس طرح محاذوں پر
مفاد ذات میں جو پگڑیاں اُچھالتے ہیں

انہیں سلام جو فردا سنوارنے کے لیے
فصیلِ جبر پہ اپنی کمند ڈالتے ہیں

جلی حروف کی ان سرخیوں پہ مت جانا
منافقوں کی ہے فطرت کہ وقت ٹالتے ہیں

☆☆☆

ڈاکٹر خیالؔ امروہوی

غم نہ کر خدشات کا اہلِ نظر مرتے نہیں
بے وسیلہ دشت کے خود رو شجر مرتے نہیں

کتنے حیرت ناک ہیں فطرت کے بے معنی اُصول
نیکیاں اوجھل تو ہوتی ہیں، شر مرتے نہیں

دستِ فطرت کی عطا ہے فن کا لافانی وجود
کوزے ہوجاتے ہیں ٹکڑے کوزہ گر مرتے نہیں

بحر کی لا انتہا بپھری ہوی امواج سے
سیپ مرجائے تو مرجائے گہر مرتے نہیں

صرف قالب ہی بدلتا ہے بحکم ایزدی
زندگی کے بعد بھی مادَر پدر مرتے نہیں

کام سے رہتی ہے جن کی عمر بھر وابستگی
ایسے محنت کش فریبی نام پہ مرتے نہیں

☆☆☆

ڈاکٹر خیالؔ امروہوی

ہر اک مقام پہ عنواں مرا جلی تو رہا
میں جس طرح بھی رہا پیروِ علیؑ تو رہا

ہر ایک فرد نے دہرائے میرے افسانے
مرے گناہ کا چرچا گلی گلی تو رہا

خلوص جل تو گیا نفرتوں کے شعلوں میں
وہ پائیدار تھا خوشبو میں صندلی تو رہا

جمال ہاتھ نہ آیا گرفت ڈھیلی تھی
حدود ذہن میں اک رنگ مخملی تو رہا

نہ آئی مصلحت اندیشیوں میں بے باکی
غلام عہد کا دستور بُزدلی تو رہا

شراب نوش تھا بدنام ہی رہا غالب
وہ اپنے دَور خدا مست میں ولی تو رہا

خاورؔ اعجاز

بام و در کہتے ہیں اب بھی دُکھ بھری آواز میں
شہر کی عزت تھے اپنے دَور کے آغاز میں

کس پہ ہوتی جارہی ہیں بند سب آسائشیں
کون خیمہ زن ہوا ہے پھر اُسی انداز میں

راستے معدوم ہوتے جارہے ہیں شوق کے
شام ہوتی جا رہی ہے عمر کی پرواز میں

ترکشِ اظہار سے میں نے بھی کچھ کھینچا نہیں
اُس نے بھی رکھا ہوا ہے کچھ کمانِ راز میں

ہم ہوئے تو حسنِ باطن ہی کے گرویدہ ہوئے
خوبیاں گرچہ کئی تھیں اُس زمانہ ساز میں

☆☆☆

خاورؔ اعجاز

غم کی آگ میں جلنا پھر مٹی ہوجانا ہے
دل کا ایسا حال بہت جلدی ہوجانا ہے

بہت سنوار بنا کر لکھتا ہوں جس پر الفاظ
میرے بعد وہی کاغذ ردّی ہوجانا ہے

دنیا کے اک کونے میں آباد ہوا ہوں میں
میں نہ ہوا تو دُنیا نے خالی ہوجانا ہے

جو میں نے چاہا وہ ساری عمر نہیں ہونا
جو وہ چاہے بس اُس پر راضی ہوجانا ہے

اب کے جو حالات ہیں اُن سے ایسا لگتا ہے
جس کا ہونا سہل نہ تھا وہ بھی ہوجانا ہے

فہیم شناس کاظمی

تھا بے قرار بہت دل کسی سفر کے لیے
میں گھر سے نکلا کسی لمحۂ دگر کے لیے

مرا لہو کسی صحرا کی تشنگی کا بھرم
اور اک کھنچی ہوئی شمشیر میرے سر کے لیے

نجانے کس نے ہواؤں کو مخبری کر دی
چراغ لایا تھا میں تیری راہگزر کے لیے

اک انتظار کا موسم ازل سے طاری ہے
بھلائے بیٹھے ہیں خود کو تری خبر کے لیے

مرا وجود ہوا کے سمندروں کا اسیر
رہا ہے دہر، کسی دست کوزہ گر کے لیے

ردائے خاک ہی چپ چاپ اوڑھ لیتے ہیں
عذاب کیا سہیں اک عمرِ بے ثمر کے لیے

شناس اتنے بھی بے مایہ تو نہیں تھے ہم
غبارِ راہ ہوئے ہیں کسی نظر کے لیے

☆☆☆

فہیم شناس کاظمی

آنکھ سے کیا جانیے منظر گرا تھا
شہر سارا راستے میں رو رہا تھا

جس ہوا میں آج تم لہرا رہے ہو
ہم کو بھی ایسا کبھی نشہ ہوا تھا

دیکھتا وارفتگی کوئی دیئے کی
جب ہواؤں سے گلے وہ مل رہا تھا

اس طرح میں چاہتا تھا تجھ سے ملنا
جس طرح سائے سے سایہ ملا تھا

آج بے نام و نشاں کیسا ہوا
جو گماں کی انتہا بھی دیکھتا تھا

یا کسی نے ہجر میں گریہ کیا
یا سمندر میں کوئی دریا گرا تھا

صابرؔ عظیم آبادی

آئینہ خانے میں جب عکس عیاں ہوتا ہے
دیدنی قامتِ زیبا کا سماں ہوتا ہے

کونپلیں دکھ کی ہری اور بھی رکھی جائیں
زیست کرنا ہی اگر بار گراں ہوتا ہے

سانس کے دشت کی پھیلی ہوئی پہنائی میں
اس کے ہونے کا ہمہ وقت گماں ہوتا ہے

اپنے آسیب زدہ گھر میں بلاؤں کس کو
خوف کا دریا ہر اک سمت رواں ہوتا ہے

اس سے پوشیدہ نہیں عیب کسی بندے کا
وہ خدا ہے وہ قریبِ رگِ جاں ہوتا ہے

بوجھ کتنا ہے کتابوں کا مرے بچوں پر
اس کا احساس مگر مجھ کو کہاں ہوتا ہے

دھوپ کے لمبے حصاروں سے نکل کر صابرؔ
رہرو آتے ہیں وہاں سایہ جہاں ہوتا ہے

صابرؔ عظیم آبادی

تماشا ہے ہمارے روبرو کیا
یہ فرقِ التزامِ ما و تو کیا

ہماری سرخروئی بڑھ گئی ہے
ان آنکھوں سے ٹپکتا ہے لہو کیا

فلک پر روشنی پھوٹی نہیں ہے
ستارے ہیں ابھی تک بے وضو کیا

نہیں ہیں جب مرے کردار اچھے
تو پھر قائم رہے گی آبرو کیا

جہاں ہوتا نہیں موجود کوئی
وہاں موجود ہے بس تُو ہی تُو کیا

یہاں کوئی نظر آتا نہیں ہے
یہ آنکھیں کر رہی ہیں جستجو کیا

گلے کس کو لگائیں ، پیار بانٹیں
کوئی بھی ہے تمہارے ہو بہو کیا

سبھی میخوار تشنہ لب ہیں صابرؔ
مئے عرفاں سے خالی ہے سبو کیا

☆☆☆

پرویز ساحؔر

شبانہ روز یہی ایک امتحان اور میں
ترا خیال ، تری یاد ، تیرا دھیان اور میں

ہم ایک دوسرے کی اَن کہی سمجھتے ہیں
بہت پرانے شناسا ہیں ، آسمان اور میں

زمانے بعد بھی میری ادا نہیں بدلی
وہی جنوں ہے، وہی سَر، وہی چٹان اور میں

وہ مجھ کو سوچتا ہے، اور میں اُس کو سوچتا ہوں
ہیں ایک جیسے ، مرا یارِ مہربان اور میں

عجب نہیں کہ کسی روز دہر میں ساحؔر
خود اپنے آپ کو کر دوں لہولہان اور میں

پرویز ساحؔر

مت پوچھ کیسے زندہ ہوں میں اِس غمی کے ساتھ
کاٹی ہے ساری زندگی تیری کمی کے ساتھ

اللہ کرے کہ اُس کا سفر کامیاب ہو
رُخصت کیا ہے اُس کو دُعا کی نمی کے ساتھ

کچھ دیر زیرِ سایۂ اشجار بیٹھ لیں
آگے بڑھیں گے پھر اُسی تازہ دمی کے ساتھ

جس درجہ میں نے پیار سے اُس سے کیا سوال
اُس نے دیا جواب اُسی برہمی کے ساتھ

ساحؔر یہ حادثہ کوئی اتنا نیا نہیں
ہوتا ہے اِس طرح بھی مگر آدمی کے ساتھ

☆☆☆

پرویز ساحؔر

ابھی وہ ٹوٹے پروں سے اُڑا ہی تھا کہ گِرا
وجودِ خستہ کا مَلبہ گِرا گِرا کہ گِرا

کھڑا ہوں راہ میں تیری چٹان کے مانند
سو اَب یہ تیری رضا ، تُو مجھے مِٹا کہ گِرا

ابھی تو اپنی ہواؤں میں اُڑ رہا ہے وہ
سو کچھ ہی دیر میں تُم اُس کو دیکھنا کہ گِرا

کہا نہیں تھا کہ تُو مجھ کو مَت پلا اِتنی
سو اب سنبھال مجھے میرے ساقیا! کہ گِرا

بہت غرور تھا ساحؔر غنیم کو خود پر
سو اَب کی بار وہ میدان میں گِرا کہ گِرا

پرویز ساحؔر

اپنی صدائے دل کو ، تصویر کر رہا ہوں
خود اپنے آپ کو میں ، تسخیر کر رہا ہوں

انجام آشنا ہوں ، پھر بھی کنارِ دریا
اک ریت کا گھروندا ، تعمیر کر رہا ہوں

جُز اس کے اور کوئی چارہ نہیں ہے باقی
میں آپ اپنے غم کی تشہیر کر رہا ہوں

شاید مرے سخن کا اِن پر ہی کچھ اثر ہو
دیوار و بام و دَر سے تقریر کر رہا ہوں

اِک نام ہے کہ جس کو ساحؔر میں مدتوں سے
لوحِ جبیں پہ اپنی تحریر کر رہا ہوں

☆☆☆

پرویز ساحرؔ

چہرہ تھا کسی کا یا تھا اک پھول
کھڑکی میں کھلا ہوا تھا اک پھول

میں رات کو اپنے گھر جب آیا
بستر پہ پڑا ہوا تھا اِک پھول

مَت پوچھ کہ کس قدر ڈرا تھا
جب میں نے اُسے دیا تھا اِک پھول

میں دیکھ رہا تھا وہ نظارہ
بارش میں نہا رہا تھا اک پھول

کھا کھا کے ہواؤں کے تھپیڑے
ٹہنی پر ڈولتا تھا اک پھول

سنتے ہیں کہ آج اُس نے ساحرؔ
جُوڑے میں سجا رکھا تھا اِک پھول

پرویز ساحرؔ

چراغ آسا دریچے میں پڑا ہوں
اُٹھائے سر پہ اپنے ''لَو'' کھڑا ہوں

تُو جیسے تُو نہیں ہے ، اور کچھ ہے
میں جیسے میں نہیں ہوں ، لوتھڑا ہوں

عجب کیا ڈوب جاؤں بحرِ غم میں
کہ مٹی سے بنا کچا گھڑا ہوں

نجانے کب کوئی مجھ کو گرا دے
سرِ راہے میں اک بُت سا کھڑا ہوں

نہیں سُنتا کسی بھی شخص کی مَیں
مگر اپنی ہی اک ضِد پر اَڑا ہوں

خُدارا کچھ تو کیجو شرم مجھ سے
کہ تم سے عمر میں کچھ دن بڑا ہوں

مرا اُس کا تعلق ہی تھا ایسا
یونہی تو مَیں نہیں اُس سے لڑا ہوں

مجھے سب لوگ ''بابا'' بولتے ہیں
میں اپنی عمر سے شاید بڑا ہوں

زمانے ہو گئے ساحرؔ کہ اب تک
کسی کی آنکھ کے تِل میں جَڑا ہوں

☆☆☆

مختار جاذبؔ

خدا کرے کوئی تصویر اب سجا لی ہو
مری طرح نہ فریم اس کے دل کا خالی ہو

میں خار ہوں تو کسی دستِ مرمریں میں چبھوں
اگر ہوں پھول تو میرا بھی کوئی مالی ہو

اُسے میں بھولوں تو کیا اور یاد رکھوں تو کیا
وہ جس سے میرا ہر اک رابطہ خیالی ہو

اُگے تو پھل نہ سہی کوئی پھول اُگ آئے
مگر خمیدہ کبھی زندگی کی ڈالی ہو

کوئی تو ہو جو مرے دکھ کو بھی کرے محسوس
کسی کی آنکھ ہو نم کوئی دل ملالی ہو

دکھائی کیوں نہ دے قول و عمل میں اس کے تضاد
وہ جس کے دل میں غزل، ذہن میں غزالی ہو

☆☆☆

مختار جاذبؔ

وہی فساد وہی خوں وہی کٹہرے ہیں
زمیں گونگی ہے یا آسمان بہرے ہیں

میں وقت آنے پہ سب کچھ تمہیں بتا دوں گا
مرے لبوں پہ ابھی مصلحت کے پہرے ہیں

یہ طول و عرض میں پھیلے ہوئے بڑے بڑے دریا
سمندروں کے لیے ناتمام ٹھہرے ہیں

جو دشمنی میں یگانہ کیے گئے تسلیم
بہت سے ان میں مرے دوستوں کے چہرے ہیں

یہ میلے کپڑے کسی اور روز دھو لینا
کہ رنگ صبح ہی سے بادلوں کے گہرے ہیں

خلوص شاملِ تخلیق فن رہے جاذبؔ
جو حرف خون سے لکھے گئے سنہرے ہیں

مختار جاذبؔ

کہ ایک عمر سے دعوے تھے خودسری کے مجھے
اسی لیے تو ملے دُکھ پیمبری کے مجھے

میں ایک ٹانگ پہ کچھ سوچ کے کھڑا نہ رہا
تمام وصف ملے تھے قلندری کے مجھے

اسی زمین پہ جنت کو بھیج دے مولا
زمانہ دیتا ہے الزام بے گھری کے مجھے

ابھی تلک تو میں خود اپنے دام کا ہوں اسیر
کوئی سکھا دے آداب دلبری کے مجھے

جو فیصلہ تجھے کرنا ہے آج کرنا ہے
ملیں گے اور مواقع نہ بہتری کے مجھے

میں رہنے والا پرستان کا نہیں جاذبؔ
دکھائی دیتے ہیں پھر خواب کیوں پری کے مجھے

مختار جاذبؔ

اس سے کیا مطلب کہ سر پر دھوپ ہے سایا نہیں
موسمِ گُل بھی خزاں بختوں کو راس آیا نہیں

جذبۂ احسان مندی نے نہ گھٹنے دی تھکن
میں شجر کے سائے میں آ کر بھی سستایا نہیں

تم سمندر تھے مگر تم کو نہ تھا میرا خیال
چند بوندوں کے لیے بادل نے ترسایا نہیں

غیر کا ہو جائے وہ یہ بھی ہے مجھ کو ناپسند
اور اپناؤں اُسے یہ بھی مجھے بھایا نہیں

آپ کی تقلید کرتا تھا کھلی آنکھوں سے میں
آپ کی کوتاہیوں کو میں نے اپنایا نہیں

اک ستارہ ہوں جو راہوں میں بھٹک کر رہ گیا
اک مسافر ہوں جو منزل تک پہنچ پایا نہیں

یا وہ معیار نظر تھا یا تھا معیارِ جمال
ایک چہرے کے سوا چہرہ کوئی بھایا نہیں

بس زمینِ شعر تک جاذبؔ رسائی تھی مری
آسماں سے میں ستارے توڑ کر لایا نہیں

☆☆☆

عطاء الرحمٰن قاضی

بے گناہوں پر روا کیا کیا ستم رکھا گیا
دل بہ دل اک جذبۂ تخلیقِ غم رکھا گیا

ہاں، بکھرتے منظروں کا ہم کو دینا تھا خراج
چشمِ خوش آثار کو دانستہ نم رکھا گیا

کہہ رہا ہے دل کی دھڑکن سے طلسم ارغنوں
نغمۂ غم بھی اسیرِ زیر و بم رکھا گیا

خارزارِ زندگی پھولوں کا گہوارہ بنا
جب زمینِ عشق پر پہلا قدم رکھا گیا

کیا تماشا اب یہ دکھلائے، عطاؔ میزانِ عشق
ایک پلڑے میں تبر اک میں قلم رکھا گیا

عطاء الرحمٰن قاضی

آج بھی تیری چاہ میں
خوش ہیں حالِ تباہ میں

یار اُلجھ کر رہ گئے
گردشِ شام و پگاہ میں

تھک کر ہم بھی آخرش
بیٹھ گئے ہیں راہ میں

کتنے جگنو، دیکھنا
کھو گئے دشتِ سیاہ میں

اور ہوئے کچھ بے اماں
آ کر تری پناہ میں

پگھل گیا کہسارِ شب
حدت تھی وہ آہ میں

آج بھی روشن ہے عطاؔ
عکسِ بہار، نگاہ میں

☆☆☆

عطاء الرحمٰن قاضی

کیسا یقین ؟ عکسِ گماں ہم عناں نہیں
دل اس کو ڈھونڈتا ہے کہ جس کا نشاں نہیں

سویا ہے اک بھنور ، تہہِ دریائے آرزو
ہنگامہ گو بپا سرِ آبِ رواں نہیں

اب بھی پڑے ہیں دھوپ کے صحرا میں اہلِ شوق
مدت ہوئی وہ سروِ رواں ، مہرباں نہیں

اُٹھا قدم تو اور ہوئیں دُور منزلیں
یہ امرِ واقعہ ہے کوئی داستاں نہیں

ہاں پھر ، سرابِ تازہ نے کچھ حوصلہ دیا
یہ کاروبارِ شوق ، میاں ! رایگاں نہیں

کیا کیا نظارے ایک جھکولے میں بہہ گئے
اب جن کا ڈھونڈنے سے بھی ملتا نشاں نہیں

ہوتا ہے ہم کلامِ زبانِ شرار میں
دنیا میں کوئی سنگ عطا ، بے زباں نہیں

عطاء الرحمٰن قاضی

جنوں کی راہ پہ کم کم سہی دل آنے لگا
یہ مرحلہ بھی چلو خیر سے ٹھکانے لگا

کسی نے پاؤں جو دہلیزِ خواب پر رکھا
ہر ایک منظرِ بے رنگ ، مسکرانے لگا

پھر ایک رنگ ہواؤں میں مسکرا اُٹھا
پھر ایک سحر سا قلب و نظر پہ چھانے لگا

یہ کون ہے جو مٹا کر ہر ایک نقشِ کہن
ہوا کی لوح پہ منظر نیا بنانے لگا

عذابِ جاں ، سفرِ آرزو ہوا کیا کیا
قدم قدم پہ کوئی مجھ کو آزمانے لگا

ملی جو فرصتِ یک دو نفس سحر سے مجھے
سکوتِ شام نئی داستاں سنانے لگا

نہ بے قراریِ جاں ہے نہ کچھ قرار عطاؔ
یہ کیسا زخم دیا ہے کسی ہوا نے لگا

☆☆☆

حمیدؔ انجم

فصیلِ بحر و بر ہے اور میں ہوں
سفر اندر سفر ہے اور میں ہوں

فضائے نیلگوں کی وسعتوں میں
بکھر جانے کا ڈر ہے اور میں ہوں

دریچہ اور رُخِ رنگیں کا جادو
سلگتی دوپہر ہے اور میں ہوں

کھلی ہیں آج کافر کی ادائیں
جہان یک دگر ہے اور میں ہوں

سکوتِ بام و در ہے اور تُو ہے
مرا رختِ سفر ہے اور میں ہوں

کوئی تعبیر خواب خود نگر کی
ستارہ شاخ پر ہے اور میں ہوں

کوئی اندوہ گیں ایسا نہ ہوگا
یہ عمر بے ثمر ہے اور میں ہوں

حمیدؔ انجم

جہاں تیرگی ہے خیالات کی
گھڑی دو گھڑی ہے طلسمات کی

جلاتے نہیں آگہی کے چراغ
کرو فکر اپنے مکانات کی

بدل جائے گا رنگِ آشفتگاں
محبت سے تم نے ذرا بات کی

وہی غم نصیبوں کی شام الم
وہی حکمرانی ہے آفات کی

مہک جائے گا یاد رفتہ سے دل
ذرا بوند پڑنے دو برسات کی

حمیدؔ اس طرح دن گزرتے نہیں
کہ اپنی خبر ہے نہ حالات کی

☆☆☆

غائر عالم

خاک و شعاعِ نور سے رنگیں بلادِ آسماں
فطرت ہے جن کو حوصلہ ہست و عدم کے درمیاں

ہر ذرۂ بے تاب ہے قائم بہ رسمِ دو جہاں
جس کی نمود و موت ہے جزو خلائے پرتواں

کب سے جہانِ تیز رو وجہِ غبارِ خاک ہے
کب سے نہادِ ذات سے نکلی نہیں ہیں بجلیاں

سب دولتِ ہستی ہوئی رزق و نمائش کی نذر
ورنہ دل و دیدہ تو تھے، بہرِ غمِ کون و مکاں

سرمایہ داری سے ہوا ہے زود ایسے ہولِ دل
ہے جنگِ جوہر آزما اقوام کو جائے اماں

سب فرد کی سعیٔ نمو جذبِ نظامِ زر ہوئی
ہے نشوِ فکر و آرزو نفع و ضرر کی داستاں

☆☆☆

ظفر اقبال نادؔر

ترے ہر وار کو ہنس کے سہا ہے
بھروں آہیں تو اس کا بھی گلہ ہے

ترے احساس کی خامی ہے ورنہ
نظر آئے جو پردے میں چھپا ہے

زمانہ دیکھیے کیا رنگ لائے
کہ دُکھ دستِ سخاوت سے ملا ہے

ترا معلوم ہے اندازِ بخشش
مری چپ ہی مرا حرفِ دُعا ہے

چلے آئے سرِ مقتل لیے سَر
تماشا وہ بھی دیکھیں گے ، سُنا ہے

جفا کا اِک نیا انداز نکلا
ظفؔر وہ پیار سے جب بھی ملا ہے

صاحبؔ نوید

حُسن والے سنبھل گئے صاحب
عقل والے مچل گئے صاحب

ہم مسلسل جو مسکراتے ہیں
غم کے معنی بدل گئے صاحب

اُتنے خورشید اور اُبھریں گے
جتنے خورشید ڈھل گئے صاحب

تُم خرد تک ابھی نہیں پہنچے
ہم جنوں سے نکل گئے صاحب

انتظارِ خزاں بھی ہو نہ سکا
موسمِ گُل میں جَل گئے صاحب

شاطرانِ زمانہ ششدر ہیں
کیا بھلی چال چل گئے صاحب

صاحبؔ نوید

اک نیا کام کرنا باقی ہے
تجھ پہ الزام دھرنا باقی ہے

سب رقیبوں کے دل میں رہتا ہوں
تیرے دل میں اُترنا باقی ہے

ہر بُرا کام کر لیا ہم نے
ہر بھلا کام کرنا باقی ہے

تیرے بِن ہم نے جی کے دیکھ لیا
اب ترے سنگ مرنا باقی ہے

مری نظروں کو تابِ دید نہیں
کہتے ہو تم ، سنورنا باقی ہے

ساری دُنیا سدھر گئی صاحبؔ
اِک تمہارا سُدھرنا باقی ہے

☆☆☆

نظمیں

فہیم شناس کاظمی

چاند کے ساتھ کہیں چلتے ہیں

راستے سو گئے
ویران ہوئی ہیں آنکھیں
ٹی وی کے رنگوں میں اب دفن ہوتی جاتی ہیں
روشنیاں
خواب ہوئے سب عریاں
ناچتے ناچتے سب خواب بنے ہیں بادل
آنکھ جھپکی ہی نہیں
رات ڈھلتی ہی نہیں
چاند کے ساتھ کہیں چلتے ہیں
شیلف میں سوئے رہیں غالبؔ و فیضؔ
زندگی صرف سخن ہی تو نہیں
تنگ آ سکتا ہے خود سے انساں
خواہش جسم سے
روح کے آزاروں سے
راستہ راستہ اُگتی ہوئی دیواروں سے
تنگ آ جائے تو پھر جاں سے گزر سکتا ہے
رُخ ہواؤں کا بدل سکتا ہے
پھر بھی
نیلے آکاش پہ اُڑتے بادل
کسی پتھر سے کہاں ٹوٹتے ہیں
کیا اذیت کا کوئی انت نہیں

☆☆☆

فہیم شناس کاظمی

کیا تم گیت سُنا سکتی ہو

جھاگ اُڑاتے پانی سے
بے رنگی یکسانی سے
لمحوں کی ویرانی سے
کیا تم خواب بنا سکتی ہو

اُلجھے اُلجھے لفظوں سے
اوس میں بھیگے رستوں سے
بچوں کے بھاری بستوں سے
کیا تم خواب بنا سکتی ہو

بہت قدیم شرابوں سے
خوں آلود گلابوں سے
دیمک زدہ کتابوں سے
کیا تم خواب بنا سکتی ہو
جنت کہیں سجا سکتی ہو
کیا تم پھول کھلا سکتی ہو
کیا تم روشنی لا سکتی ہو
بے انت سی اس تاریکی میں
کیا تم گیت سنا سکتی ہو

فہیم شناس کاظمی

تم

تم محبت کے دمکتے ہوئے سورج کی طرح
میں کسی روز تمہیں
پھولوں کا گلدستہ اگر پیش کروں
کیا مجھے خود کو چھونے کی اجازت دو گی
تم
محبت کے دمکتے ہوئے مہتاب سی ہو
میں تمہیں چاندنی خوابوں سے بُنا بستر
کبھی تحفے میں گر پیش کروں
اپنے بستر پہ مجھے آنے کی اجازت دو گی
اپنی آنکھوں پہ مجھے ہونٹ رکھنے کی اجازت دو گی
میں وہ صحرا کا پرندہ جسے پانی نہ ملا
اپنے ہونٹوں سے مجھے پینے کی اجازت دو گی
رتجگے آنکھوں میں چبھتے ہیں مرے
اپنے سینے پہ مرا سر رکھ کے
مجھ کو سونے کی اجازت دو گی

ارتقاء

وہ پھول چنتے چنتے
اتنی بدل گئی ہے
خوشبو میں ڈھل گئی ہے

وہ خواب تکتے تکتے
حد سے نکل گیا ہے
خود خواب ہو گیا ہے

☆☆☆

محمد انور خالد

منیرہ سورتی کی مغفرت کا مسئلہ
(گجرات کے لیے ایک نظم)

منیرہ سورتی کاٹی گئی تہہ دار اندھیرے میں
اسے موڑا گیا نچلے بدن سے
اُن رسیلے زاویوں سے
جن کی تہہ داری مسلّم ہے
منیرہ سورتی نے ایک لمحے کے لیے
پوری حیاتی میں
اذیت ناک لذت کا مزہ چکھا
ہم اس کی مغفرت کے واسطے پھر بھی
دعا کرتے رہیں گے
مستقل گہرے اندھیرے میں
وہ پورے ہوش میں تھی
جب اُٹھائی جا رہی تھیں اس کے ہر جانب سے لاشیں
اور وہ مردہ نہیں تھی
وہ اپنے ہوش میں تھی
اس کی آنکھیں دیکھتی تھیں ہر طرف
جب میں نے اس کی پتلیاں دیکھیں
وہ پورے ہوش میں تھی
اور مری بالکل نہیں تھی آخری جھٹکے سے پہلے تک
منیرہ سورتی کی مغفرت فی الواقعہ اک مسئلہ ہے

☆☆☆

محمد انور خالد

پہلے کچھ لوگ ہوا کرتے تھے
(افتخار جالب کے لیے)

پہلے کچھ لوگ ہوا کرتے تھے
دھوپ آنگن میں اُتر آتی تھی بادل کی طرح
نرم، خوش رنگ، خوش اطوار
بہت دیر ہوئی
اب کہیں کوئی نہیں
پہلے کچھ لوگ ہوا کرتے تھے آباد جزیروں کی طرح
جن کو دریافت کیا جاتا تھا
جن کے آباد خرابے میں رہا جاتا تھا
پہلے کچھ لوگ ہوا کرتے تھے خاموش اُداس
ایک سُو بیٹھ گئے صبح ہوئی شام ہوئی
حلقہ زن بیٹھ گئے شعلۂ ناپید کے بیچ
پھر سمندر سے گرجتی ہوئی بارش آئی
اور منڈیروں کے تلے بیٹھنے والا لڑکا
خاک میں خاک ہوا
کھیتیاں ڈھے گئیں بارش نے زمینیں کھا لیں
دل محرر ہے سو کاغذ پہ مکاں رکھتا ہے
کوئی رویا نہ ہنسا کہیں آیا نہ گیا
پہلے کچھ لوگ ہوا کرتے تھے ہنستے ہوئے روئے ہوئے
آباد و خراب
اے رفیقِ شبِ آزار و الم
پہلے ہر شہر میں کچھ لوگ ہوا کرتے تھے
اب کہیں کوئی نہیں
دھوپ سے رنگ اُڑا جاتا ہے میدانوں کا

☆☆☆

سجادمرزا

سرکشی

میں روپ رنگ کی دنیا اُجاڑ بیٹھوں گا
اور اپنی زیست کو خود ہی پچھاڑ بیٹھوں گا
کہ تیرے حُسن کی لذت نہ پا سکا گر میں
اور اپنی زیست میں خوشیاں نہ لا سکا گر میں

بس اور وقت کو مہلت نہ دو مری جاں تم
چھپا کے درد کو دل میں نہ رو مری جاں تم
کہ اس خموش محبت کو جانتا ہوں میں
رواج و رسم و روایت کو جانتا ہوں میں

ترے لبوں پہ جو اک کپکپی سی طاری ہے
تری حیات و محبت کی سوگواری ہے
کہ اس جہاں میں سسکنا بھی اک روایت ہے
جہانِ عشق میں رونا بھی اک عبادت ہے

مگر میں سوچتا ہوں ،ظلم کی بھی اک حد ہے
کہ اس جہان کا احساس و خون جامد ہے
تو اپنی شرم و حیا سے لپٹ کے بیٹھی ہے
قیود و رسمِ جہاں سے چمٹ کے بیٹھی ہے

بس اور ضبط کی حد بھی نظر نہیں آتی
کہ تیری آنکھ بھی آنسو ہے آج برساتی
مجھے بھی سرکشی اب اختیار کرنا ہے
اور اپنے جینے کی خاطر مجھے بھی مرنا ہے

☆☆☆

ارشدمعراج

کہانی تیری سمت اُلجھ جاتی ہے

کہانی کا ہمیش اپنا بہاؤ ہے
مسلسل بہہ رہی ہے
انت سے بےانت کی جانب
جہاں کالے سمندر ہیں

بہت ضدی ہو تم
اور یہ سمجھتی ہو
کہ نازک سی کلائی کی بریسلٹ کو گھماؤ گی
تو دنیا گھوم جائے گی
زمانہ چپکے چپکے سوچ کی سیڑھی پہ چڑھتا ہے
گھڑی کی سوئیاں اگلے مداروں کو بڑھیں
تو بیل گاڑی تھک سی جاتی ہے
مکاں اور لامکاں سب ایک ہوتے ہیں

مرے موزے بہت گندے ہیں
ان کو جلد دھو دینا
میں کالج واپسی پر سبزیاں اور دال لے آؤں___؟
تمہارے موڈ کو کیا ہو گیا ہے___؟
چلو کل فلم دیکھیں گے

یہاں حجرے میں جٹی عرض کرتی ہے
کہ ہیر کا سائیں مر جائے
تو بکرا پیر کا قربان کر ڈالوں
یہ غیرت کا تقاضا تو نہیں ہے
یہ روانی ہے
ہوا کے ساتھ جینے اور مرنے کی کہانی ہے
وہ ہٹی تھی کراڑوں کی
جہاں شب بھر دیا جلتا ہی رہتا تھا

نہیں رات کا قصہ نہیں ہے
سویرے کسی کو دیکھیں گے
اندھیرے میں سجھائی ہی نہیں دیتا
تمہاری سانس پھر سے چل رہی ہے
جسم بھی تپتا ہی جاتا ہے
کیا Panadol کھائی تھی
سلگتے ریگزاروں کے سفر میں
آبلے تو پڑ ہی جاتے ہیں
بلوچوں سے جو یاری ہو تو دکھ
سہنا ہی پڑتا ہے
"نہیں
یہ کیا کہا تم نے
پڑوسن جھوٹ کہتی ہے
اسے تو تاپ نے بوکھلا دیا ہے
اور وہ ہذیان بکتی ہے
کہاں میں اور کہاں رانجھن"

ارشد معراج

سچ دیوار سے لگا دے گا

گلابی خواب کے بستر پہ لیٹی
حاملہ خواہش، سنہری دن جنے گی تو
ہماری داستاں لکھتے محرر کے قلم سے
پیار کی بیلیں اُگیں گی
جسم کی دیوار تک جو پھیل جائیں گی
سہانے سبز موسم میں
رہائی کی خبر اخبار کے ماتھے پہ اُبھرے گی
مورّخ خواب اور پھر خواب کی تحریر دیکھے گا
وجود
اور ذات سے آگے کی دنیا
اک کہانی ہے
کہانی کا کہاں پر انت ہوتا ہے
کسے معلوم ہے
کسے معلوم ہے کہ گھٹنوں چلتا زمانہ
پاؤں کے بل چل رہا ہے
ہوا کو جیب میں رکھے
برستی بارشوں کے ساتھ اُڑتا ہے
خلا کو اوڑھتا ہے
آنکھ میں دریا بساتا ہے
پروں پر تیرتا ہے
ایک سے دو چار کرتا ہے

فقط اک باز آیا ہے
گلابی خواب کا بستر ثمر آور ہوا تو پھر ___
_____؟؟

☆☆☆

ارشد معراج

پچھلے پہر کی آنکھوں میں لکھی تحریر

پرندوں کو گلابی اُنگلیوں کی پور پر گننا
دھڑکتے خواب اور ہلچل مچاتی سانسوں پر ___ قابو جمانا
ورد کرنا
پاؤں کے ناخن سے لے کر سر کے بالوں تک
مجسّم آرزو بننا
مکانوں سے پھسلتی دوپہر کی اوٹ سے
لپٹی ہوئی سیلن کے دامن سے
چھپی ہوئی کالی سیہ آنکھوں کے خوابوں میں
فلک کی کھڑکیاں کھولے
کہیں اندر تلک یوں جھانکنا
کہ جان لینا
جان ہو جائے
مگر اب کیا
کہ ہونے اور نہ ہونے کی گھپاؤں میں
بہت مدت سے لٹکا ہوں
جہاں جالے اُجالے روک رکھتے ہیں
سنہرے منظروں کی شال میں لپٹا ہوا دن
یاس کے جھولے میں دُبکا ہے
زمانے کی سلیٹی سی سلیٹوں پر
ہوا کی تیکھی رنگت نے وچھوڑا، رائیگانی
وصل کی آدھی درج کی ہے

کہاں ہوں میں ___؟
کہاں ہے ___؟
انت سے بے انت کی جانب
مچلتا، شور کرتا، گدگداتا، ہڈیوں میں سرسراتا
____ تُو ____؟

☆☆☆

شائی فریاد

آنکھیں رکھ کر بھول گئی ہوں

میں بچپن سے ایک بھلکڑ
آنکھیں رکھ کر بھول گئی ہوں

اور اب یہ حالت ہے اپنی
گماں کی لاٹھی ٹیکتے ٹیکتے
ان رستوں پر آ بیٹھی ہوں
جن کے آگے راہ نہیں ہے

من انگنا میں یاد تمہاری

من انگنا میں یاد تمہاری
گھنگھرو باندھ کے ناچ رہی ہے
دِل پاتال میں شور بپا ہے
سانسیں تھک کر ہانپ رہی ہیں
یہ منہ زور رقاصہ
تب تک ناچے گی
جب تک دل کی بوسیدہ سی سب دیواریں
پھوٹ نہ جائیں
گھنگرو سارے ٹوٹ نہ جائیں

☆☆☆

حروفِ زر

(قارئین کے خطوط)

انگارے (شمارہ ۱۸) اپنی جملہ رعنائیوں کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ اداریہ میں مدیر نے عدم برداشت، جذباتیت، دہشت اور جھنجھلاہٹ سے متعلق جو گفتگو فرمائی، وہ دل و دماغ کو مَس کرتی ہے۔ اِسی جذبۂ شر کی وجہ سے معاشرے میں سارا بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔

فراق گورکھ پوری جیسے اُردو ادب کے اہم شاعر اور نقّاد کی ذات و فن کے حوالے سے ڈاکٹر نجیب جمال کا لکھا ہوا مقالہ کئی اعتبار سے معتبر تھا۔ ادب اور معروضی حقیقت (جمالیات ۸) از ابنِ حسن اپنے اندر بہت فکری اور معنیاتی گھمبیرتا لیے ہوئے تھا۔ ابنِ حسن صاحب اِس مشکل موضوع کو مستقل مزاجی کے ساتھ آگے لے کر بڑھ رہے ہیں۔ یہ قسط وار تحقیقی و علمی مقالہ اُن کے مطالعۂ استغراقی اور مشق و مزاولت کی چغلی کھاتا نظر آتا ہے۔ نوبل خطبہ برائے امن از مدر ٹریسا (مترجم نیر عباس زیدی) ایک اعلٰی تحریر تھی۔ بلاشبہ مدر ٹریسا امن اور خدمتِ انسانیت کے حوالے سے دُنیا کی ایک غیر معمولی شخصیت کی حامل ''نن خاتون'' تھیں۔ ایک عمر کئی زندگیاں، ڈاکٹر انوار احمد کے قلم سے لکھا ہوا بے مثل و بے نظیر ڈرامہ تھا۔ اُنہوں نے اِس ڈرامے کے ہر کردار کو بہ احسن طریق نبھایا۔ بخدا اگر اسے ٹی۔ وی پر دکھایا جائے تو تہلکہ مچ جائے۔ اس ڈرامہ کے ٹریجڈی سے بھرپور کلائمکس نے ہمیں رُلا رُلا دیا۔ فی زمانہ ایسے عمدہ ڈرامے از قبیلِ شاذ ہیں۔ اُستاد شبیر خان (طبلہ نواز) کی عالمانہ و ساحرانہ گفتگو نے ابھی تک ہمیں اپنے سحر میں لے رکھا ہے۔ بے شک ہم نے اُن کی گفتگو سے بہت کچھ بھر پایا۔ احمد رضوان بھی تحسین کے سزاوار ہیں کہ اُنہوں نے بہت سُلجھے ہوئے سوالات کیے اور خان صاحب کی ذات و فن کو کھرچا۔ غزلوں میں خاور اعجاز، نوازش علی ندیم (پہلی تین غزلیں) راؤ وحید اسد کا کلام پسند آیا۔ یہاں ہم از راہِ گفتگو یہ بھی کہتے چلیں کہ خاور اعجاز کی دوسری غزل کے تمام شعروں کے مضامین حمدیہ تھے اس لیے اسے حمد ہی گردانا جانا چاہیے۔ نظموں میں احمد صغیر صدیقی اور ڈاکٹر علی اطہر (پہلی دو نظمیں) قدرے معیاری تھیں۔ حروفِ زر کے گوشے کی کمی ہمیں شدت سے محسوس ہوئی اس کے بغیر یہ شمارہ ادھورا سا لگا۔ انگارے کو بہتر سے بہتر کی طرف لے جانے کے لیے حروفِ زر کا مستقل اہتمام بہت ضروری ہے۔

(پرویز ساحر۔ ایبٹ آباد)

محمد عظمت اللہ کی نظم کو ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے ''دلگداز شعری تخلیق'' قرار دے کر مجھے حالت ''سکرات'' میں پہنچا دیا۔ ڈاکٹر نجیب جمال نے فراق صاحب کی شاعری میں حسیاتی اور جمالیاتی فضا پر اچھی طرح روشنی ڈالی ہے۔ ''ادب اور معروضی حقیقت'' نہایت ادق قسم کا مضمون ہے۔ افسانے میں نے

نہیں پڑھے ہیں۔غزلوں کے حصے میں خاور اعجاز، پرویز ساحر اور نوازش علی ندیم کے اشعار متاثر کرتے ہیں۔خصوصاً نوازش علی ندیم کی غزلیں میرے لیے ان کا نام آشنا نہیں مگر اِن میں Talent موجود ہے۔
میری نظم میں ایک سطر کتابت کی غلطی کا شکار ہوئی ہے:

''منظر گیا___ بدلا آسماں'' لکھا گیا ہے۔درست سطر ہے:''منظر گیا___ بدلا سماں''

آپ نے خطوط کا حصہ اس شمارے میں شامل نہیں کیا۔یہ صفحات اہم ہوتے ہیں بشرطیکہ ان میں شمارے کی مشمولات پر بات کی گئی ہو۔مجموعی طور پر اس شمارے نے مجھے لطف نہیں دیا۔شعری حصے کی طوالت کم کر کے مضامین کے صفحات بڑھائیے۔آخر آپ تجزیئے نظم و غزل کا سلسلہ کیوں نہیں شروع کرتے۔آپ کے ہاں ڈاکٹر شگفتہ اور خاور اعجاز موجود ہیں۔

(احمد صغیر صدیقی۔کراچی)

''انگارے'' ۱۸ میں مندرجہ ذیل دو شعر تازہ واردانِ بساط ادب کے لیے اُلجھن کا سبب بن سکتے ہیں سو اپنے ردِعمل کا اظہار کر رہا ہوں

مرے سرہانے کوئی جس طرح مہتاب رکھتا ہے
مجھے یہ خواب کافی دیر تک بے خواب رکھتا ہے (خاور اعجاز)

کئی قرن سے اندھیروں سے جنگ ہے میری
کئی رتوں سے اثاثہ مرا چراغ کی لَو (نوازش علی ندیم)

خاور اعجاز صاحب نے ''سرہانے'' کو غلط بندھا ہے یہ لفظ (س+ر+ہ+ا+ن+ے) کے بجائے (س+ر+ھ+ا+ن+ے) بروزنِ فعولن ہے۔سند کے لیے میرؔ اور آتشؔ کے شعر ملاحظہ کیجیے

سرھانے میرؔ کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے (میرؔ)

عشق ہے آنکھوں کو تلووں سے مجھے ملنے کا
پائنتی یار کی ہو میرا سرھانا شبِ وصل (آتشؔ)

اگر خاور اعجاز صاحب پہلے مصرع میں معمولی سی تبدیلی کر لیں تو یہ شعر ساقط الوزن نہیں رہے گا۔
جناب نوازش علی ندیم صاحب نے لفظ قرن (بہ فتح 'ق' و بہ سکون 'ر') کو قرن (بفتح ق و بفتح 'ر') باندھا ہے جو کہ سراسر غلط ہے کیونکہ جنگ یا زمانے کے معنوں میں استعمال ہونے والے متذکرہ بالا لفظ میں ''ر'' ساکن ہے۔اہلِ فارس کے ہاں ایک لفظ قرن (بفتح ق و بفتح ر) ملتا ہے جو کہ یمن کے ایک قبیلے کا نام ہے۔
ہمارے تخلیق کار جدت کے نام پر الفاظ کے تلفظ سے بیگانگی کا جو ثبوت فراہم کر رہے ہیں اس

سے ہمیں اجتناب کا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ہمارے ہاں فروغ پانے والا'' کا تا اور لے دوڑی'' والا رویہ اس بات کا غماز ہے کہ ہمارے شعراء لفظ ''شعر'' کے مفہوم سے ہی بیگانہ ہو چکے ہیں۔

(عطاء الرحمٰن قاضی۔عارف والا)

انگارے شمارہ ۱۸ موصول ہوا، موجودہ شمارے میں فراق کی شاعری پر ڈاکٹر نجیب جمال کا مضمون اور مدر ٹریسا کا لیکچر کمال کی تحریریں ہیں جب کہ احمد رضوان کا انٹرویو کیا شاندار اور معلوماتی انٹرویو ہے۔خالد سعید ایک مرد سے بخوبی نباہ رہے ہیں جب کہ غزلوں میں احمد صغیر صدیقی، پرویز ساحر، خاور اعجاز اور راؤ وحید اسد کی غزلیں، ڈاکٹر علی اطہر کی نظمیں پسند آئیں۔

(فہیم شناس کاظمی۔نواب شاہ)

رسید و اطلاع:

ڈاکٹر فرمان فتح پوری (کراچی)، ڈاکٹر معین الرحمٰن (لاہور)، ڈاکٹر مظفر عباس (لاہور)، غلام حسین ساجد (لاہور)، سجاد مرزا (گوجرانوالہ)، ناصر بخاری (اسلام آباد)، صفدر علی شاہ (سرگودھا)، ظفر اقبال نادر (عارف والا)، ابن حسن (گوجرانوالہ)، ایم۔فیاض خالد (گجرات)، ناصر عباس نیر (جھنگ)، ندیم اقبال پاشا (وہاڑی)،